سیرۃ النبی ﷺ

جلد ششم

علامہ سید سلیمان ندوی ؒ

دار المصنفین شبلی اکیڈمی

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کتابِ مستطاب

سِیرۃُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی

سوانحِ اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جلد ششم

مشتمل بر تعلیماتِ اخلاق

اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے اور اسلامی فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے اور پھر اسلامی اخلاقی تعلیمات اور فضائل ورذائل اور اسلامی آداب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا تھا۔

تالیف

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی سنہ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء

دارُالمصنّفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ یو۔پی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

کتاب	:	سیرۃ النبی ﷺ حصہ ششم
مصنف	:	مولانا سید سلیمان ندویؒ
صفحات	:	۵۸۰
ایڈیشن	:	۲۰۱۹ء
مطبع	:	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)
ناشر	:	دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)
باہتمام	:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

ISBN.978-93-80104-72-0
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. : 19
SHIBLI ROAD, AZAMGARH - 276 001 (U.P.)
e-mail : shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

سیرۃ النبی ﷺ حصہ ششم

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندہ کی خدمت کو عام مسلمانوں میں اور مخصوص اہلِ علم کی نگاہوں میں مقبولیت کی نعمت عطا فرمائی: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: ۱۴-۳۴) خدا کی نعمتوں کا شمار کون کرسکتا ہے۔

قدردانوں کا تقاضہ تھا کہ اس کی چھٹی جلد جلد شائع ہو، مگر کتاب کی ضخامت اور کاغذ کی گرانی کے سبب سے اس میں رکاوٹوں پر رکاوٹیں پیش آتی رہیں اور آخر کئی برسوں کے بعد وہ دن آیا کہ پوری کتاب دوبارہ چھپ کر ختم ہوئی اور اب وہ آپ کے سامنے ہے۔

اب ساتویں جلد (معاملات) کا معاملہ درپیش ہے، بقدرِ توفیق اس کے کچھ صفحات لکھے بھی گئے ہیں، مگر ابھی کام بہت باقی ہے، احباب سے اس کے حسن انجام کی دعا کا خواستگار ہوں۔

والسلام

ہیچمداں　　۲۹ر شوال ۱۳۶۰ر ہجری

سلیمان　　۱۹ر نومبر ۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الکتاب والحکمة والصلوٰة والسلام علی رسولہ نبی الرحمة
وعلیٰ آلہ واصحابہ اولی العزم والھمة

اے تو، بہ بہیں صفت سزاوار نامِ تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ ز گنج خانۂ راز برآدمیاں در سخنِ باز
عالم ز تو شد بہ حکمت آباد حکمت ز تو یافت آدمی زاد

☆

در قربتِ حضرت مقدس پیغمبرؐ پاک، رہبرم، بس
گنجینۂ کیمیائے عالم پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بسریر پادشاہی توقیعِ سپیدی و سیاہی
(خسروؔ)

سیرۃ نبوی ﷺ کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے، یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں، یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں، اسی لئے عوام کے اس وہم کو دور اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ان اوراق میں اس

باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جز اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاقِ حسنہ ''اسمائے حسنیٰ'' کا پرتو ہیں، بار بار اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق خالق تعالیٰ کی کسی بھی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہو سکتی، ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے، بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے، اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں، جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے، مگر خدا کی اس صفتِ علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں، حالاں کہ حقیقی صفت علم خدا میں ہے، بندہ میں نہیں، لیکن چوں کہ خدا تعالیٰ اپنی صفت علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے، اس لئے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں (۱) ورنہ در حقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں، یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے، اسی لئے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراک، اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے اور بس! لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (شوریٰ:۴۲-۱۱)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آ گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے، اس سے مقصود وہ تعلیمات وہدایات ہیں جو آج ان کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں یا ان کے موجودہ پیروان کی طرف منسوب کرتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبرِ صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی وہ اس کے لئے بالکل مناسب تھی، یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کے لئے تکمیل فرما دی گئی۔

کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آ گئے ہیں، چوں کہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے، اس لئے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھا نہیں گیا ہے، ایسے موقعوں پر اگر شک وشبہہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۲۴، مطبوعہ مدینہ بجنور۔

ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے، اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں، پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں، جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کرلیا ہے، موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گزار ہوں۔

آیات واحادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح وحکم کی تشریح میں اپنے ذوق وفکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا، سہو وخطا انسان کی فطرت ہے پھر کیوں کر دعویٰ کروں کہ اس سے میرا فکروذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلۂ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا، اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں (رحمۃ اللہ تعالیٰ)۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت میں اس آئینۂ محمدی ﷺ کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل وصورت کی تزئین وآرائش کا ذوق پیدا کرے اور وہ سمجھیں کہ ایمان وعبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق وعادات کی درستی ہے۔

طالب رحمت
سید سلیمان ندوی
دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۴/ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

تعلیماتِ نبوی کا تیسرا باب

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبوی کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے، اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق وفرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے، انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بہ حسن وخوبی انجام دینا اخلاق ہے، اس کے اپنے ماں باپ، اہل وعیال، عزیز ورشتہ دار، دوست واحباب سب سے تعلقات ہیں، بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ، وطن، قومیت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی، خوش حالی اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو حکومت وجماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لئے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستے سے بھٹکنے نہ دے، دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب ''اسلام'' نے بھی یہی کیا ہے، آئندہ ابواب میں اسلام کی انہیں کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے، اس کو تفصیل سے بتانا ہے۔

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے، چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے، خیرات نیکی اور چوری بدی ہے، لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے، خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق (مؤطا مالک حسن اخلاق) — میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

یہ امام مالکؒ کی مؤطا کی روایت ہے، مسند احمد، بیہقی اور ابن سعد (۱) وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق — میں تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ ﷺ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لئے مکہ بھیجا، انہوں نے واپس آکر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی، وہ یہ تھے:

رایتہ یامر بمکارم الاخلاق (۲) — میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی، اس کے چند فقرے یہ ہیں:

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا، اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں (۳)۔

---

(۱) کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدرآباد و زرقانی شرح موطا جلد ۴ صفحہ ۹۲ مطبعہ کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ (۲) صحیح مسلم مناقب ابی ذرؓ جلد ۲ صفحہ ۳۳۹ مصر (۳) ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت جلد ۱ صفحہ ۲۰۶۔

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، آنحضرت ﷺ کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ''وہ پاک دامنی اختیار کریں، سچ بولیں، اور قرابت کا حق ادا کریں'' (۱)۔

قرآن مجید نے جا بجا آنحضرت ﷺ کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ:

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ: ۶۲-۲)

یہ پیغمبر ان اَن پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا اور ان کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں، ایک پاک وصاف کرنا جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے، اور دوسرا حکمت۔

۱- تزکیہ کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے، سورۂ والشمس میں ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۔ (شمس: ۹۱-۷ تا ۱۰)

قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی، بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملایا وہ ناکام رہا۔

دوسری جگہ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۔ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۔ (الاعلیٰ: ۸۷-۱۴)

بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۔ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۔ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۔ (عبس: ۸۰-۱ تا ۴)

پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الوحی ج ۱ ص ۴ و کتاب الجہاد باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام ج ۱ ص ۴۱۲۔

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس ''تزکیہ'' کا مفہوم کیا ہے، جس کو اس نے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی خاص خصوصیت قرار دی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلادیں، ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اوران کے اخلاق واعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں، چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کیے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ ﷺ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

۲- حکمت: اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے، گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جاچکی ہے، مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم وعرفان کے معنی میں ہے، جو نورِالٰہی کی صورت میں نبی ﷺ کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار ومظاہر رسول ﷺ کی زبان سے کبھی مصالح واسرار اور کبھی سنن واحکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم وعرفان کے ان عملی آثار ونتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں، سورۂ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت وتعظیم، قرابت داروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولادکشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰۤی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَةِ (اسراء: ۱۷-۳۹)

یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے، جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔

سورۂ لقمان میں ہے کہ:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَةَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰهِ (لقمان: ۳۱-۱۲)

اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا کرو۔

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ ''کسی کو خدا کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر''، ان

آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امورِ خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرتاً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلّم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں، ''حکمت'' کہا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو ''حکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن پاک کے اس اظہارِ حقیقت سے کہ وحیٔ محمدی ﷺ کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے، یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں، خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.	اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

(حج: ۲۲-۷۷)

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوتِ محمدی ﷺ کے جسم کے دو بازو ہیں، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا اور ان ہی کے مجموعہ کا نام ''اسلام'' ہے۔

حقوقِ عباد کی اہمیت: ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمِ محمدی ﷺ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوقِ عباد، یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات، حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس (ظالم بھائی) کو چاہئے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرا لے، ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ جائیں گی'' (۱)۔

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامہ ص ۹۶۷۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ "قیامت میں نامۂ اعمال کی تین فردیں ہوں گی، ایک وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کرے گا، دوسری وہ جس میں سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا، جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے، جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو یا نماز نہ پڑھی ہو تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کردے گا اور بخش دے گا، لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے(۱)" اس سے معلوم ہوا کہ معاملاتِ انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا، اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟ (۲) چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے، جب تک وہ اپنے اہل وعیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے، اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف سے زیادہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہولیا۔

اسلام کے ارکانِ پنج گانہ اور اخلاق: بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بہ ظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہوگیا ہے، حالاں کہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کردیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غم خواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح وترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی

(۱) مسند احمد ج۶ ص۲۴۰ وحاکم عن عائشۃ موضوع الدواوین ثلاثۃ ج۴ ص۵۷۵ (۲) یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے، دیکھو ہدایہ کتاب الحج ص۲۱۳ مرتبہ مولانا عبدالحئی مرحوم۔

ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوش بو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں، قرآن پاک اور تعلیمِ نبوی ﷺ کے جو اشارات اس باب میں ہیں حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

''خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لئے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہیں جنہوں نے گو شراب نہیں پی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو خدا اس کے گناہ کو معاف کر دے گا، پھر فرمایا کہ نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ ''اے میرے اللہ!'' جس نے یہ بات نہیں پیدا کی اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا، میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے، میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور جو بھوکے محتاج کو میرے لئے کھانا کھلاتا ہے،'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز اسی لئے فرض کی گئی اور اسی لئے حج کے ارکان بنائے گئے تاکہ خدا کی یاد کی جائے'' تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہے تو اس یادِ الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے'' (۱)۔

اس اخیر حدیث کو ابنِ جریر، ابی حاتم، اور دوسرے اہلِ تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بہ سند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یک جا کر دیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ ''جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز ہی نہیں'' (۲)، اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمائے ارشاد ہوا کہ ''روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ

(۱) جلد اول باب فضیلۃ الخشوع ص ۹۵ مطبع مجتبائی (۲) تفسیر ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم، سورۂ عنکبوت، آیت مذکورہ ج ۳ ص ۴۱۴ مطبوعہ مصر ۱۹۲۷ء۔

دے۔"(۱) ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

اخلاقِ حسنہ اور ایمان: اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے، جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لئے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاق حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورہ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے، جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۔

بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرتے ہیں، اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے، اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں .... اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

(مومنون: ۲۳-۱تا۹)

ان آیتوں میں اہل ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض)، فیاضی (زکوٰۃ) پاک دامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ: اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے، تقویٰ ہے، وحیِ محمدی ﷺ نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم طرف کرو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو خدا پر قیامت پر، فرشتوں پر کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود (یا خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں

(۱) صحیح بخاری کتاب الصوم باب من لم یدع قول الزور ج ۱ص ۲۵۵ و جامع ترمذی ابواب الصوم باب ماجاء فی التشدید فی الغیبۃ للصائم ج ۱ص ۱۵۰ و ابوداؤد و ابن ماجہ کتاب الصوم باب ماجاء فی الغیبۃ والرفث ص ۱۲۲۔

وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِہِمۡ اِذَا عٰہَدُوۡا وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ (بقرہ:۲-۱۷۷)

کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوۃ دیتا رہا اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت ،تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں، یہی وہ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ راست بازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف، فیاضی، ایفائے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاقِ حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف: محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دئے گئے ہیں جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں، اور وہی باتیں خدا کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں، چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا:

وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا وَّ اِذَا خَاطَبَہُمُ الۡجٰہِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا ۔ وَالَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ۔ وَالَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَہَنَّمَ اِنَّ عَذَابَہَا کَانَ غَرَامًا ۔ اِنَّہَا سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۔ وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَکَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ۔ وَالَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ وَلَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَلَا یَزۡنُوۡنَ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ......وَالَّذِیۡنَ لَا یَشۡہَدُوۡنَ الزُّوۡرَ وَ اِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا کِرَامًا ۔ وَالَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡہَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا ۔ وَالَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا ہَبۡ لَنَا مِنۡ

اور رحم والے خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گذارتے ہیں، اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور کر کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے اور جہنم برا ٹھکانہ اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں، بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گذریں اور جو خدا کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے، جس کو خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا......اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغو بات پر گذر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہیں اور جب خدا کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور

اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا.

(فرقان: ۲۵-۶۳ تا ۷۴)

یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو ودرگذر میانہ روی اور قتل وخوں ریزی اور بدکاری نہ کرنا اور مکروزور میں شریک نہ ہونا، وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف: وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں:

......وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ. وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ. وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ. وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ. اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ.

(شوریٰ: ۴۲-۳۶ تا ۴۳)

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، تو جو کوئی معاف کردے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا، اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں، ملامت تو ان پر ہے، جو لوگوں پر ازخود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں، ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے اور بے شبہ جو مظلوم ہونے پر بھی ظالم کو معاف کردے اور سہہ لے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

......اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ. اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.

(آل عمران: ۳-۱۳۳)

جنت ان پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے، جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور جو غصہ کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور خدا اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ. وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ.

(قصص:۲۸-۵۴،۵۵)

یہ وہ ہیں جن کو دوہرا ثواب ملے گا، اس لئے کہ انہوں نے صبر کیا، اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں، اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں، اور کہہ دیتے ہیں، کہ ہمارے لئے ہمارا عمل اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے، تم سلامت رہو، ہم ناسمجھوں کو نہیں چاہتے۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا. (دہر:۷۶-۸)

اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاقِ حسنہ کا درجہ اسلام میں: اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں جو دعا مانگتے تھے، اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

واھدنی لاحسن الاخلاق لایھدی لاحسنھا الا انت واصرف عنی سیئاتھا لایصرف عنی سیئاتھا الا انت (مسلم باب الدعا فی الصلوٰۃ)

اور اے میرے خدا تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے، اور ان کو نہیں پھیر سکتا لیکن تو۔

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے، وہ حسنِ اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے، فرمایا:

اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے، وہ حسنِ اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے، اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوا:

ان الرجل لیدرک بحسن خلقه درجةقائم اللیل وصائم النهار

انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے، جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں کی رات بھر کی شب بے داری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے وہی درجہ حسنِ خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، فرمایا:

خیارکم احسنکم اخلاقاً (بخاری کتاب الادب)

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

ما من شئٍ یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق فان صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصوم والصلوٰة

(قیامت کی) ترازو میں حسنِ خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حسنِ اخلاق والا اپنے حسنِ خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں ان ہی الفاظ کے ساتھ ہے، لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) میں مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے، یعنی یہ کہ حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں، اس حدیث نبوی ﷺ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حسنِ اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے، اس میں حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے:

خیر ما اعطی الناس خلق حسن

لوگوں کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم ،نسائی ،ابن ماجہ،ابن حنبل،طبرانی اور ابن ابی شیبہ میں ہے،اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنادیا،ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احب عباد اللہ الی اللہ احسنہم اخلاقاً (طبرانی)	اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے،جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسنِ خلق خدا کی محبت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے،فرمایا:

ان احبکم الیّ واقربکم منی فی الآخرۃ مجالس محاسنکم اخلاقاً وان ابغضکم الیّ وابعدکم منی فی الآخرۃ مساویکم اخلاقاً (ابن حنبل وطبرانی وحبان وشعب الایمان بیہقی) (۱)	تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں ،جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بداخلاق ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں،ایک رات بھر نماز پڑھتیں ،دن کو روزہ رکھتیں ،اور صدقہ دیتیں ،مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کیے رکھتی تھیں، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ اس میں کوئی نیکی نہیں ،وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ وہ جنتی ہوگی،(۲) ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براابن عازب ؓ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت کو لے جائے فرمایا،انسان کو غلامی سے آزاد کر،انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا،اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ،اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو

(۱) یہ تمام حدیثیں کنز العمال جلد ثانی، کتاب الاخلاق باب اول ص۲ تا ۳ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۱۲ھ سے ماخوذ ہیں۔

(۲) ادب المفرد امام بخاری باب لا یوذی جارہ ص۲۶۔

کھلا اور پیاسے کو پلا اور نیکی بتا اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک (۱)، غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف ولوازم: ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف واخلاق ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں، جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی گویا اسی قدر اس ایمان کے منشا میں زیادتی وکمی ہوگی، یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغِ زیر دامن ہے، جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا:

۱- ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جن میں سے ایک حیا ہے۔

۲- ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں، جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو تا کہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو۔

۳- جس میں تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا، جس کو خدا اور اس کا رسول ﷺ سب سے پیارا ہو، جو دوسرے کو صرف خدا کے لئے پیار کرے اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں بتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴- جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا، حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

۵- تین باتیں ایمان کا جز ہیں، مفلسی میں بھی خدا کی راہ میں دینا، دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶- تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔

۷- مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان ومال اس کی امانت میں دے دیں۔

۸- ایک شخص آکر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ کون سا اسلام سب سے بہتر ہے، فرمایا،

(۱) مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۴ ص ۲ حیدر آباد دکن۔

(بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے ان جانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا (سلام کرنا)۔

۹- ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسول ﷺ! اسلام کیا ہے؟ فرمایا: اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا، پھر پوچھا: ایمان کیا ہے؟ فرمایا: صبر کرنا اور اخلاقی جواں مردی دکھانا (سماحت)۔

۱۰- مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے، اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

۱۱- مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بددعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔

۱۲- ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا خدا اس کی مدد میں ہوگا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔

۱۳- مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔

۱۴- جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

۱۵- بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے(۱)۔

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہئے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاقِ حسنہ صفاتِ الٰہی کا سایہ ہیں: لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔

---

(۱) یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتبِ حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں، ہم نے ان کو مجمع الفوائد ص ۲۰ تا ۲۲ و مابعد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان ص ۶ تا ۱۱ سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں، مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

ہم ان ہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں، جو صفاتِ ربانی کا عکس ہیں اور ان ہی کو برا کہتے ہیں جو خدا کی صفات کے منافی ہیں، البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں، جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جا سکتا، جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پر جلال صفتیں بھی ہیں جو صرف خدا ہی کو زیبا ہیں، جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کی مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں، خدا کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاک ساری اور تواضع ہو اور خدا کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب وفیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب وفیض میں ترقی کریں گے ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے(۱)، اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

---

(۱) ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے، دیکھو سیرت جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۸۴-۴۰۵۔

اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے، جن کے مکتب میں آکر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہ کیا اور آداب و اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کئے جو سیکڑوں اور ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے مگر ایک تنقیدی نظر یہ بتادے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے اور ان میں درس گاہِ عالم کے سب سے آخری معلم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی، جیسے عام انبیا علیہم السلام اور بعض مذہبوں کے بانی، دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل ودانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان میں سے اول کو انبیا اور مصلحین دین اور دوسری کو حکما کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس وتعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کئے، پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ ”حکمِ خداوندی کو قرار دیا“، اس حکم وفرمان الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں، نہ ان کی تعلیمات میں علت ومعلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے اور نہ ان احکام وتعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت ومعلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض وغایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے، مگر بحث ونظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے، اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت، مگر

ع یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکمِ خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امرِ ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔

انبیا اور حکما میں جو اصلی فرق وامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیا کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ

ان کی معصوم زندگی ان کے مقدس کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بنِ مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے، اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محو حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوئی، وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا، وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے، مگر خود عمل کی ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا، وہ سچائی اور راست بازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے، مگر وہ خود سچا اور راست باز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چوں کہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہیں، اس لئے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی، بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے اور انبیا علیہم السلام چوں کہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، جو ان کی تعلیم ہے وہی ان کا عمل ہے، جو ان کے منہ پر ہے وہی دل میں ہے، اس لئے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوش بو بن کر اڑتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیا اور حکما یعنی موسیٰؑ، عیسیٰؑ محمد رسول اللہ ﷺ اور سقراط اور افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحبِ اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور آنحضرت ﷺ کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلعِ انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیا علیہم السلام یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں، ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا کہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں تاکہ بعد کے آنے والے بھی اس نشان قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لئے حسب ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے:

۱- اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

۲- اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

۳- اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لئے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی: تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیا اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلامؐ کی حیاتِ پاک کے برابر جامعِ کمالات نہیں، دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانیِ مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے، توراۃ کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے، جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں، ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن میں ہر جگہ ان کو ان بے ہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ، ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی۔

حضرت عیسیٰؑ کی تینتیس برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں۔

ان انبیا علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران، اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں کیوں کہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ "یہاں (سیرت محمدی ﷺ) پورے دن کی روشنی ہے، جس میں محمد ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے(۱)"، آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو، اس کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو

---

(۱) باسورتھ اسمتھ کی کتاب سیرت محمد ﷺ ص ۱۰۸۔

حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو، الا فلیبلغ الشاھد الغائب۔

قول کے ساتھ عمل: اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہِ زیتون کے پرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰؑ) کی معصومانہ باتیں سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع وبدائع اور دل کش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں، اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام ودہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”سب کچھ جو تمہارا پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو آسمان کی بادشاہت میں داخل (۱) نہ ہوگے“، کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا، وہ جس نے یہ کہا کہ ”شریروں کا مقابلہ نہ کرو“، کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو (۲)، کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر“، کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے کہا کہ اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو (۳)، کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”تم سے اگر کوئی تمہارا کرتا مانگے، تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو (۴)“، کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی، ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ:

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (بقرہ:۲-۴۴)

کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ. (صف:۶۱-۲،۳)

تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔

---

(۱) انجیل متی باب ۱۹-۲۳ (۲) انجیل متی باب ۵-۴۴ و لوقا باب ۶-۲۷ (۳) متی باب ۵-۳۹ (۴) ایضاً-۴۱۔

ایک شخص نے آکرام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا: کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ فان خلق رسول اللہ ﷺ کان القرآن(۱) جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حاملِ قرآن کی سیرت میں بہ صورتِ عمل تھا، اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد واعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا، جنہوں نے آپ ﷺ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ ﷺ سے کپڑا مانگا تو خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی، سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح وتفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہ نماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں، اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال ونصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کے اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہم عصروں کے سامنے پیش نہیں کیا لیکن محمد رسول ﷺ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف وخطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد وتبصرہ کے لئے پیش کیا، فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (یونس:۱۰-۱۶) (اے منکرو) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے۔

پھر آپ ﷺ کو خطاب کر کے خود آپ ﷺ سے فرمایا گیا:

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ. (القلم:۶۸-۴) (اے محمد) بے شک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔

کامل ومکمل: اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک وصاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر

(۱) ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب فی صلوۃ اللیل ص ۱۹۰۔

بنی اسرائیل کی سنگ دلی اور کج روی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ:۶۲-۲) — وہ ان کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف ومصفی بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گنہ گاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم ازکم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، ۲۳ برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیمِ اخلاقی کا تنوع: اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں، بلکہ سیکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درس گاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰؑ کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰؑ کے مکتب میں عفو ودرگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں در بہ در بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی درس گاہِ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو ونما پارہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم وفن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔

آپ ﷺ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد وعابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ ﷺ کے

سامنے آ کر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ وفن کے مطابق آپ ﷺ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، مدینۃ النبی ﷺ کی اس درس گاہِ اعظم کو غور سے دیکھو، جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے، اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبوی تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے فرماں روازیرِ تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ، زبیرؓ و معاویہؓ وسعد بن معاذؓ و سعد بن جبیرؓ جیسے ارباب رائے وتدبیر ہیں، کہیں خالدؓ، ابو عبیدہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمراں، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زہاد وعباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذرؓ وسلمانؓ وابودرداؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں، جو مسیحِ اسلام کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گذارا کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ ومحدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولت مندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق واعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں (۱)۔

☆

(۱) اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصول کی تفصیل وتشریح کے لئے ہم کو تھوڑی دیر کے لئے فلسفۂ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے، جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی وجسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، ان کے اسباب وعلل کی تلاش، ان کے اصول وقوانین کی تحقیق اور ان کی غرض وغایت کی تعیین یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی اور موجودہ عہد میں علمِ نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب وعلل، اصول وقوانین اور غرض وغایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے، ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے، تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب ان ہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں جنہیں یونانی اصطلاح میں ''رواقیہ'' اور ''لذتیہ'' کہا گیا ہے، موجودہ اصطلاح میں پہلے کو ''ضمیریہ'' اور دوسرے کو ''افادیہ'' کہہ لیجئے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہئے، پہلا فریق اخلاق کی بنا جذبات پر قرار دیتا ہے اور دوسرا عقل پر، پھر اس منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہوگئے، ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل ماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں، علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں یا کسی بیرونی ماخذ سے، جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ لاسکے، انہوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر، جنہوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انہوں نے بہ اختلافِ مذاق انسان کی اصل فطرت کو انسان میں ایک خاص

حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا، جنہوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انہوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم ورواج کو ان کا ماخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم یا بادشاہ کا حکم یا سوسائٹی کے رسم ورواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی، اس لئے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا، ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بہ جائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا، جو اخلاق کے امہاتِ مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے، تا کہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکامِ الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کردے، فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکیں، ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات، ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں، اسی طرح معیارِ اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض وغایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اسرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہوکر ایک کام کو انجام دے یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے یا اس کے ساتھ کسی مصلحتِ عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو، اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد خدا کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے، جس طرح وہ ایک خوب صورت چیز کو خوب صورت یقین کرنے پر مجبور ہے، ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں، اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے موقع بھی ہوسکتے ہیں، جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جارہی ہو، اسی لئے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ، اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے، اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہئے، وجدان کہئے، حاسۂ اخلاقی کہئے، ضمیر کہئے، اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر آب وہوا، خصوصیاتِ اقلیم، زبان، مذہب، رسم ورواج، طرزِ حکومت وغیرہ، صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلادلیل متفق اور متحد ہیں، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرتاً ودیعت ہے، جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں، اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لئے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لئے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانیات، جیسے حسن وقبح، خوب صورتی اور بدصورتی کا یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے، یا برا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

تعلیمِ محمدی ﷺ نے گو اخلاق کے ان اصول ومبانی کی طرف کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کئے ہیں، مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے، کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم وفلسفہ میں نہیں بلکہ ان کے عمل میں ہے، اس لئے ''علم بلا عمل'' کی کوئی قدر وقیمت اس کی نگاہ میں نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ''عمل بلا علم'' کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے، اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کئے ہیں، مگر اخلاق کے باب میں اس کی عالمانہ تحقیق وتلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کئے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں، وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں، ان ہی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہئے ہونا چاہئے، ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت وموافقت زیادہ ہوگی اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی، اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے، پھر کرنے

والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہئے، اس کا وجدان بھی یہی ہو، اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے، اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوعِ انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے، الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہوگی اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس قدر اس توافق میں کمی ہوگی کہ خدا کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحانی و ایمانی کمال میں نقص پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دیں، لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ بجھاتی ہے تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے، جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے، اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصولِ مسرت یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے، مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیۂ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی: چوں کہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے، اس لئے اس کی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہئے، اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی، مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے، اسی قدر وہ قابل قدر ہوتا ہے، ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی الوانِ نعمت چن دیں، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہ میں ذاتی نفع یا ریا کاری یا نمائش، یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان ونمک ہی رکھ دیں تو اس کی وقعت اور قدر وقیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدمِ اخلاص کے یہ اثرات ہیں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت: اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض وغایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے، بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے

نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی، ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لئے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے یا سخت تکلیف پہنچائیں گے، اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بہک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڈھے یا کنویں میں گر کر مر گیا تو وہ بلانے والا ابدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے، میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوا تھا، اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا، جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوا پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے، چپکے سے اٹھا لیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا، لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو، پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے، راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے، حالاں کہ یہ واقعہ نہ تھا تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہ گار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا، اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لئے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورہ آل عمران میں ہے:

وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا (آل عمران: ۳-۱۴۵)	اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں، فرمایا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ:۲-۲۶۴)

اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے، جو لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، جن کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں:

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری باب اول)

انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔

اور اس کی مزید تصریح کے لئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

ولکل امرئ ما نویٰ فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ، ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ (۱)

ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے، تو جس کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت خدا و رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے، تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے، جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی۔

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لئے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، حسنِ نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑا سا بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف و ستائش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق کی تائید: آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف بہ حرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان ایس میکنزی اپنی تصنیف ''مینول آف ایتھکس'' کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے:

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول کتاب الایمان باب ماجاء ان العمل بالنیۃ ج ا ص ۱۳۔

’’جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے، صاف ہے، یعنی فعلِ ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات کو شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں، ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے، جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں‘‘۔

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہے:

’’اسی لئے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے، اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ ’’بہ جز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے، جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے‘‘(۱)۔

اخلاق کے لئے ایمان کی شرط: جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت، یعنی قلب کے عمل پر ہے تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لئے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں، تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں، دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکم راں ہیں، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکم راں ہے، پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے، اسی لئے وحیِ محمدی ﷺ نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا، ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے، فرمایا:

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (بقرہ:۲-۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے، جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور خدا اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے، آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں:

(۱) علم اخلاق کتاب اول باب ششم ص ۱۱۰ ترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۴۱ھ ہجری۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (نور:۲۴-۳۹)

اور جو خدا اور قیامت کو نہیں مانتے، ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے، جب وہاں وہ جائے تو اس کو کچھ نہیں پائے۔

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ وتار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ. (نور:۲۴-۴۰)

یا (خدا اور قیامت) کے نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے، اس لہر پر دوسری لہر ہے، اس پر گھٹا چھائی ہے، تاریکیاں ہیں، ایک پر ایک، جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔

جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا، دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہوسکتا ہے۔

غرض وغایت: اسی لئے آنحضرت ﷺ کی شریعتِ کاملہ میں نفس عمل مطلوب نہیں، بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض وغایت صحیح ہو، عمل قالب ہے تو صحیح غرض وغایت اس کی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے، حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض وغایت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ غرض وغایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہوسکے، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں، لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے، بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہونی چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنا اور اعلا، پست اور بلند، متعدد غرضیں اور غایتیں ہوسکتی ہیں، ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اس کو اس کے گھر تک بہ آرام پہنچا دیتے ہیں، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچ کر بڈھا خوش ہوکر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا، یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف

کریں گے، اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے، یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دین دار سمجھیں گے، یہ بھی غرض ہوسکتی ہے کہ آج اگر جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے، بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی اس خوشی کے لئے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں، بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہوکر یہ کام کرتے ہیں، غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہوسکتے ہیں، لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بہ تدریج پستی سے بلندی کی طرف جارہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی ونفسانی غرض وغایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے، اس کے بعد عزت وشہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لئے کرنا بھی گو پست مقصد ہے، مگر پہلے سے بلند ہے، پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے، مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے، یہ بالکل فطری بات ہے، کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے مگر جب اس کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر وقیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہوجاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض وغایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں، لیکن درحقیقت اس میں بھی گو اس دنیا کی نہیں، لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض وغایت شامل ہے، اس لئے یہ اعلاترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لئے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض وغایت قرار نہیں دی گئی ہے، یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں لے کے ڈال دے کوئی بہشت کو

ضمیر کی آواز: یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرلیتا ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے،

غریب ولا چار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرتاً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں ہے، ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت، بری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گنہ گاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصولِ اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اس کے نتائج ہیں، قرآن کہتا ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا. (الشمس:۹۱-۸) ہر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحیِ محمدی ﷺ کی اصطلاح میں اس کا نام ''نفس لوّامہ'' (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامہ میں ہے:

وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ. (قیامہ:۷۵-۲) اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا:

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ. وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ. (قیامہ:۷۵-۱۴) بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے۔

نواسؓ بن سمعان انصاری ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت ﷺ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں، آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے دریافت کیا، فرمایا: ''نیکی حسنِ اخلاق کا نام ہے، اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو

پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں (۱)'' اسی طرح وابصہؓ بن معبد نامی ایک صاحب خدمتِ نبوی ﷺ میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے، چاروں طرف جاں نثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ ان کو روک رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ''وابصہ قریب آجاؤ'' جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا، اے وابصہ! میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو، یا تم بتاؤ گے؟ عرض کی ''حضور ہی ارشاد فرمائیں''، فرمایا: ''وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو''، عرض کی: سچ ہے یا رسول اللہ ﷺ فرمایا:

یاوابصة استفت قلبک واستفت نفسک	اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر اور اپنے نفس سے فتویٰ
البر ماطمان الیہ القلب واطمانت الیہ النفس	لیا کر، نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو،
والاثم ماحاک فی القلب وتردد فی النفس	اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بن میں
وان افتاک الناس (۲)	ڈالے، اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔

یہی وہ حاسۂ اخلاقی ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کی صاف وسادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر ہوش میں آکر جب وہ توبہ واستغفار کرتا ہے اور پشیمان ونادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے، لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:

ان العبد اذا اخطأ خطیئة نکتت فی قلبه نکتة	بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک
سوداء فاذا هو نزع واستغفر وتاب صقل قلبه	سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، تو اگر اس نے پھر اپنے کو علاحدہ کر لیا
وان عاد زید فیها حتی تعلو قلبه	اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو اس کا دل صاف
	ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا
	جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔

(۱) مسلم کتاب البر والادب باب تفسیر البر والاثم ج ۲ ص ۳۷۹ و مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۸۲ (۲) مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۲۸ مصر۔

اس کے بعد فرمایا، یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. (۱) (تطفیف: ۸۳-۱۴)

کبھی نہیں، بلکہ ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزلِ مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھچی ہیں اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں، لیکن ان پر پردے پڑے ہیں، راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو اور ادھر ادھر مڑو نہیں، جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے، خبردار پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے، پھر فرمایا: یہ راستہ اسلام ہے اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کے حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے:

هو واعظ الله فى قلب كل مؤمن (۲)

وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرت وانبساط: یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گو تمام تر صحیح نہیں ہے، تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتاً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے، لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض وغایت ہونی چاہئے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں، ایک غریب ولاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے، لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے، لیکن وہ اس کی محرک علت اور غرض وغایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض وغایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ خدا اور اس کی رضامندی کا حصول۔

---

(۱) جامع ترمذی ابواب التفسیر تفسیر آیت مذکور ج ۲ ص ۱۷۱ (۲) مشکوٰۃ کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنة ص ۳۱ بحوالہ احمد ج ۴ ص ۱۸۲-۱۸۳ و بیہقی فی شعب الایمان ورزین وترمذی مختصراً۔

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوات کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا نیکی کی غرض و غایت نہیں بلکہ اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

وَلٰكِنَّ اللهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ.

لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا، اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر کے دکھایا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگادی، یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

(حجرات: ۴۹-۷)

اسی آیتِ پاک کی تفصیل محمد رسول ﷺ نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی:

اذا سرتک حسنتک وسائتک سیئتک فانت مومن (۱)

جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور تمہاری بدی تم کو غم گین کر دے تو تم مومن ہو۔

من سرته حسنته وسائته سیئته فهو مومن (۲)

جس کو نیکی خوش اور برائی غم زدہ بنادے وہ مومن ہے۔

من عمل سيئة فكرهها حين يعمل وعمل حسنة فسر فهو مومن (۳)

جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی، وہ مومن ہے۔

غرض نیکی پر مسرت وانبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقۂ لذتیہ کے لئے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی رکھی ہے اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرمادی ہے۔

رضائے الٰہی: اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے،

(۱) مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباھلی ج ۵ ص ۲۵۱، ۲۵۲ ومستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۴ حیدر آباد ومختصر شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر وابن حبان وابوداؤد عن عمر بن الخطاب (۲) طبرانی فی الکبیر عن ابی موسی کنز العمال جلد اول ص ۳۷ (۳) مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۳ حیدر آباد۔

اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوش نودی اور رضا مندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہئے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے، یہیں آ کر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے، حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور معلمِ حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض و غایت کیا قرار دینی چاہئے، انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال اور ان ہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسنِ عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ. (بقرہ:۲-۲۰۷)

بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی خوش نودی چاہنے کے لئے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

پھر مال کے متعلق فرمایا:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (بقرہ:۲-۲۶۵)

اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوش نودی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ:۲-۲۷۲)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا. (نساء:۴-۱۱۴)

اور جو یہ تمام کام خدا کی خوش نودی کے لئے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ. (رعد:۱۳-۲۲)

اور جنہوں نے خدا کے لئے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا ہے، اس میں کچھ چھپے اور کھلے طریقہ سے خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں، ان ہی کے لئے ہے پچھلا گھر۔

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھولی گئی ہے:

اَلَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهُ يَتَزَكّٰى. وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى. اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى. (لیل:۹۲-۱۸تا۲۰)

جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے، کسی کا اس پر احسان نہیں ہے، جس کو ادا کرنے کے لئے دیتا ہو، بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب کے لئے دیتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر وتوضیح آنحضرت ﷺ نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے، ایک صحابی پوچھتے ہیں یارسول اللہ ﷺ! کوئی اس لئے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لئے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لئے کہ اس کو شہرت حاصل ہوتو ان میں سے راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے؟ فرمایا ''اس کو جو اس لئے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو'' (۱)، ایک دفعہ ارشاد فرمایا ''گھوڑا باندھنا کسی کے لئے اجر کا موجب، کسی کے لئے پردہ پوش اور کسی کے لئے گناہ ہے، اجر کا موجب اس کے لئے ہے جو خدا کی رہ میں اس کو باندھتا ہے تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے، پردہ پوش اس کے لئے ہے، جو ضرورتا اس لئے باندھتا ہے کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے تو وہ رحم وشفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے اور گناہ اس کے لئے ہے جو فخر اور نمایش کے لئے باندھتا ہے۔'' (۲)

اس تعلیم کا سب سے موثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہؓ زار زار روئے، حضرت ابو ہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لئے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے اور جو جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا: بارالٰہا! میں شب وروز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے، پھر خدا فرمائے گا: تو تو اس لئے یہ کرتا تھا کہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا، (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا)، پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا: کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا، یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟ عرض کرے گا ''کیوں نہیں، اے میرے رب، دریافت کرے گا تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟''

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا ج۱ص۳۹۴ (۲) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الخیل لثلثۃ ج۱ص۴۰۰ و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل ج۲ص۱۰۹۳ کتاب التفسیر باب تفسیر اذا زلزلت ج۲ص۱۴۱ و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب اثم مانع الزکوٰۃ ج۱ص۳۶۴۔

جواب دے گا: میں اہلِ استحقاق کا حق ادا کرتا تھا، اور خیرات دیتا تھا، ارشاد ہوگا: تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے، پھر خدا فرمائے گا تو تو اس لئے یہ کرتا تھا تا کہ لوگ کہیں کہ تو بڑا سخی ہے تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا، (تو اپنا بدلہ پا چکا)، اس کے بعد وہ لایا جائے گا، جو جہاد میں مارا گیا تو خدا اس سے دریافت کرے گا تو کس بات کے لئے مارا گیا؟ کہے گا خدایا، تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا یہاں تک کہ مارا گیا، خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے، خدا کہے گا تو تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا، پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔" (۱)

حضرت معاویہ ؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے، پھر بولے: خدا اور اس کا رسول سچا ہے اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ. اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (ہود:۱۱-۱۵،۱۶)	جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے، بے کم وکاست، ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، مگر دوزخ، اس دنیا میں انہوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد گیا۔

غرض اگر ہمارے اخلاق واعمال کی غایت خودغرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے، تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے، بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہے:

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ:۲-۲۷۲)	اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (رعد:۱۳-۲۲)	اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لئے صبر کیا۔
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى . اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى. (لیل:۱۹،۲۰،۲۱)	اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لئے کرتا ہے۔

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

(۱) جامع ترمذی ابواب الزهد باب ماجاء في الرياء والسمعة ج۲ ص۶۳۔

فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (الروم:۳۰-۳۸)

تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول: آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے نفس بنیادی اصول سے چلتا ہے، توراۃ نے اپنی اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے، جس میں کسی اصول اور غرض وغایت اور علت ومصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی، انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے، تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں، مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے، ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے یا گناہوں سے داغ دار ہے، عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گنہ گار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے، کیوں کہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدم اور حوا گناہ گار تھے اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے، جس سے بچنا انسان کے لئے ممکن نہیں، اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مرجائے تو وہ گنہ گار مرا اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا، بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا، کیوں کہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے، اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (روم:۳۰-۳۰) (خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بَلٰی یعنی خدا کا اعتراف ہر انسان روزِ ازل کر چکا ہے، اس لئے اس دنیا میں آکر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا، اس کا وہ اقرار واعتراف اس کی بے گناہی کے لئے کافی ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زریں حرف لکھے ہیں وہ اپنے ہوش وتمیز کے بعد یا ان کو ابھار کر چمکا دیتا ہے یا مٹا ڈالتا ہے، فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ. (التین:۹۵-۴)

ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا۔

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا:

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ. فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّاشَآءَ رَکَّبَکَ. (انفطار:۸۲-۷،۸)

جس خدا نے تجھ کو بنایا، پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا، پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے، اس میں قیامت اور حشر ونشر یعنی انسان کی جزا وسزا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے، جس لفظ کا ترجمہ ہم نے ''ٹھیک کیا'' کیا ہے، اس کے لفظی معنی ''معتدل کیا'' کے ہیں، یعنی اس کو قوی کا ہر قسم کا اعتدال بخشا، نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قوی کا اعتدال داخل ہے دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے سورہ اعلیٰ میں ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی. الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی. وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی. (اعلیٰ:۸۷-۱تا۳)

اپنے بلند وبرتر پروردگار کی پاکی بیان کر جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا، پھر راہ دکھائی۔

راہ دکھانا، یعنی ہدایت، انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں، سورہ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا. اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا. (دہر:۷۶-۲)

ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو، پھر کر دیا اس کو سنتا دیکھتا، ہم نے اس کو راہ سجھا دی، تو وہ یا شکر گذار (نیکوکار) ہوتا ہے یا ناشکر (بدکردار)۔

غرض اس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی، اب عقل وتمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گذار یا ناشکر، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا برا ہو جانا خود اس کا کام ہے، سورۂ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا. فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا. قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا. وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا. (شمس:۹۱-۷تا۱۰)

قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (یا سجھا دیا) اس کی نیکی اور بدی، تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف رکھا اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا (گندہ کر دیا)۔

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہ گار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے، بلکہ اس کی اصلی فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے، اسی لئے یہ کہا گیا:

فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ. (روم: ۳۰-۳۰)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

یہ دینِ فطرت اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں جن کی بنیادی چیز توحید ہے، آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے، وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا (۱)، اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے، وحیِ محمدی ﷺ نے اسی مسئلہ کو اپنی ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ انہوں نے اپنی زبانِ حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا بَلٰی ہاں! (بے شک تو ہمارا پروردگار ہے)، یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ ”دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ۔“

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت میں معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں لاتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر: ۳۵-۱۸) اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔

کُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ. (طور: ۵۲-۲۱) ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ الروم ج ۲ ص ۷۰۴ و کتاب الجنائز باب اذا سلم الصبی الخ ج ۱ ص ۱۸۱ و مسلم کتاب القدر باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ الخ ج ۲ ص ۳۱۲۔

الا لایجنی جان علٰی ولدہٖ ولامولود علٰی والدہٖ (۱) | ہاں! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنہوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے، انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہ گار اور داغ دار ہی ٹھہرایا ہے، انہوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے، اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے، غم گین دنیا کے لئے کتنی بڑی عظیم الشان خوش خبری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور نا کردۂ گناہ بچہ بھی گناہ گار اور جہنم کا ایندھن ہے، آپ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے، فرمایا کہ ”خدا کا قلم بچہ سے اس وقت کے لئے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے“۔ (۲)

باغِ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس مسلمان کے بچے بچپن میں مر گئے، وہ خدا کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور ان کو جنت میں لے جائیں گے“ (۳)، آنحضرت ﷺ کے شیر خوار صاحب زادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا، ”یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پئے گا“ (۴)، اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے، فرمایا ”خدا کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے (۵)“، لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرما دی، ایک دفعہ رویا میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کم سن بچوں کا ہجوم تھا،

---

(۱) سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبة یوم النحر ص۲۲۵ (۲) صحیح بخاری کتاب الطلاق باب الطلاق فی الاغلاق والکرہ الخ ج۲ ص۷۹۳ وکتاب المحاربین باب لایرجم المجنون ج۲ ص۱۰۰۶ اور ترمذی ابواب الحدود فی من لا یجب علیه الحد ج۱ ص۲۶۳ (۳) صحیح مسلم کتاب البر والصلة والآداب باب فضل من یموت له ولد ج۲ ص۴۰۲، ۴۰۳ (۴) ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی الصلوة علی ابن رسول اللہ ﷺ ص۱۱۰ (۵) صحیح مسلم کتاب القدر باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة ج۲ ص۳۱۳۔

فرمایا یہ وہ کم سن بچے تھے جو دینِ فطرت پر مر گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ اور مشرکوں کے بچے؟ فرمایا ''اور مشرکوں کے بچے بھی (۱)'' ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کم سنی میں مرجانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے، لیکن چوں کہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا کام ہے، اس لئے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا آپ ﷺ نے مناسب نہیں سمجھا، ایک دفعہ ایک صحابیؓ کا بچہ مر گیا تھا، ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت ﷺ سے عرض کی، ''یا رسول اللہ ﷺ! اس کو مبارک ہو، یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا اور نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا''، فرمایا، ''اے عائشہؓ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے کچھ لوگ پیدا کئے ہیں اور جہنم کے لئے کچھ لوگ'' (۲) ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مرجانے والے کم سن بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے جو ان کے لئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے اور ان کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے: ''خداوندا! اس کو میرے لئے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو'' (۳)، احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت ﷺ نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ ''وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے''۔ (۴)

خوف و رجا: اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گذرے ہیں، ایک کو رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں، پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل، عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنالو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے

(۱) صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرویا بعد الصلوۃ الصبح ج ۲ ص ۱۰۴۴ (۲) یہ حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر باب مذکور ج ۲ ص ۴۱۴ میں ہیں، نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت له ولد ج ۲ ص ۴۰۲، ۴۰۳ مطبوعہ مصر (۳) ہدایہ کتاب الصلوۃ باب الجنائز فصل فی الصلوۃ علی المیت ج ۱ ص ۶۹ مطبوعہ مصر (۴) صحیح مسلم کتاب صلوۃ المسافرین وقصرها باب الاوقات التی نهی عن الصلوۃ فیها ج ۱ ص ۳۰۸ وصحیح بخاری کتاب الحج باب فضل حج المبرور ج ۱ ص ۲۰۶ و ترمذی ابواب التفسیر تفسیر سورہ ص، ج ۲ ص ۱۵۹، و کتاب الحج باب فضل الطواف ج ۱ ص ۱۷۵۔

کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قویٰ سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہ راہ ان دونوں گلیوں کی بیچ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا، وہ اخیر اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے، اس کی شریعت میں خدا سے ناامیدی اور کفر ایک ہے، وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی ناامید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا، قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا:

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ. (حجر:۱۵-۵۵)　　(ابراہیم!) ناامیدوں میں سے نہ بن۔

پھر حضرت یعقوبؑ کی زبانی تعلیم ملی:

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ. (یوسف:۱۲-۸۷)　　اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو، اللہ کے فیض سے ناامید وہی ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔

اس امت کے گنہ گاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (زمر:۳۹-۵۳)　　اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا، تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو۔

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پرامید رہنے کی تاکید کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں (۱)" یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے وہی اس کے لئے ہو جاتا ہوں، اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیتِ کریمہ ہے:

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (زمر:۳۹-۹)　　بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے، رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی کتاب الزهد باب فی حسن ظن بالله تعالیٰ ج ۲ ص ۶۴۔

یعنی اس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یک جا ہیں، گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ اور باز پرس کا ڈر بھی ہے اور خدا کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے، خدا کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہ ڈر اس کو غافل، بے باک اور گستاخ نہیں ہونے دیتا اور یہ امید اس کو مایوس، غم زدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی، اسی لئے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوءِ انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کر کے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے:

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا يَرْجُوْنَ (نساء:۴-۱۰۴) اور تم کو تو خدا سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور ایک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے، کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے اور جب وہ اس کو نہیں پاتا تو دل شکستہ ہو جاتا ہے، وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہیاور جب وہ نہیں ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے، لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نیکی کا کام کیا اور بہر حال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا، اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو، خدا کی خوش نودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا، اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے اور ان کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے، ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں، یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے، جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں، وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں، مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور خدا کے فضل و کرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹتی، امیر ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولا دوالا ہو کہ بے اولاد، کامیاب ہو یا ناکام، دولت مند ہو یا دیوالیہ، ہر حالت میں وہ پُر امید رہتا ہے، مشکلات میں، بیماریوں میں، محتاجیوں میں، ناکامیوں میں، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ خدا کی رحمت کا امیدوار ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں تو وہاں ضرور ہے، اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ:

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔ (آل عمران:۳-۱۹۵)

اخلاق اور رہبانیت: اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہئے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں، اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لئے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے، جو رہبانیت، تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے، اسی لئے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علاحدگی، اہل وعیال، عزیز وقریب اور دوست واحباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لئے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دین داری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دین داری قرار دیتے تھے، لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لئے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دین داری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال، اعزہ واقارب، دوست واحباب اور قوم وملت کے فرائض وحقوق بجالانے کی تکلیف سے بچ جائیں، اسی لئے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی پوری تیئیس برس کی زندگی اسی مجمع انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گذاری ہے، یہی طرز عمل خلفائے راشدین ﷺ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ ﷺ کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عملِ صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجرد، علاحدگی، خلوت نشینی، ترکِ عمل اور ترکِ جماعت کے لئے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں، ان

سے ہٹ کر نہیں، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشیں ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلقِ الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا وہ اپنے دست وبازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ ودعوت، تعلیم وموعظت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں؟ حالاں کہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں، اسی لئے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں ہے، قرآن پاک میں ہے:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم:۶۶-۶) تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت ﷺ نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا: کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار ہے اور نگراں ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا) امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہ بان ہے(۱)۔

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اسی لئے وحی محمدی ﷺ نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا کہ:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال:۸-۲۵) اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گنہ گاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔

بلکہ اس کی لپٹ گنہ گار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآن پاک میں اصحابِ سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرضِ تبلیغ سے بے پرواہ رہنے والے اشخاص کو بھی گنہ گاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

دنیا درحقیقت جدوجہد اور دار وگیر کا ایک میدان ہے، جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں، راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال ولحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لئے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات

(۱) صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المراۃ راعیۃ فی بیت زوجہا ص ۷۸۳۔

سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے، اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے، بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے:

ان المسلم اذا کان یخالط الناس ویصبر علیٰ اذاھم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علیٰ اذاھم(۱)	وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علاحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے، کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے، تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں، فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں، ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے، یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت ﷺ نے دنیا میں پیش کیا، اور تمام بڑے بڑے صحابہؓ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کم زور ایمان ہے(۲)۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر: اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بہ خود سامنے آجاتا ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بہ قدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ (یعنی اچھی باتوں کے لئے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے، قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے:

---

(۱) شعب الایمان بیہقی وجامع ترمذی ابواب صفۃ القیامۃ باب حدثنا ج۲ص۷۷ (۲) صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان کون النھی عن المنکر الخ ج۱ص۳۸۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۳-۱۱۰)

تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لئے باہر لائی گئی، اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔

يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ:۹-۷۱)

وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔

پھر خاص طور سے حکم ہوا:

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمان:۳۱-۱۷)

اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ:

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر:۱۰۳-۳)

وہ آپس میں سچائی اور ثباتِ قدم کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (بلد:۹۰-۱۷)

اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے، اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہ بانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں" (۱) عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے، اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کرلی ہے جس کا نام "شخصی آزادی کی بحالی" ہے، لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر فرمایا، جیسا کہ ابھی گذرا کہ "كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته" (تم میں ہر شخص نگہ بان ہے اور تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی (۲) قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے، تا کہ سوسائٹی کی شرم

(۱) سفرِ تکوین ۴-۹ (۲) صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المرأة راعية في بيت زوجها ص ۷۸۳۔

اور جماعت کا خوف لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے، بنی اسرائیل کے لئے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا، بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی، وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی، اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے، ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا، لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا، بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا ہے، لیکن ان پر جب عذابِ الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا، بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا، پہلا تو اپنے گناہ کے بہ دولت اور دوسرا اپنے فرض تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے، سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر میں ہے:

وَاِذْقَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا نِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ. فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ (اعراف: ۷-۱۶۴، ۱۶۵)

اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا یا سزا دینے والا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لئے ان کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں، تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے، بچا لیا اور گناہ گاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہ گار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اس کا کیا بلکہ خود رسول کا بھی یہ فرض نہیں، فرمایا:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ
رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔
(مائدہ:۵-۹۹،نور:۲۴-۵۴)

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لئے سورۂ مائدہ میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (مائدہ:۵-۱۰۵)
اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے، تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس آیت پاک کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ ''لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں''، ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے اس کے معنی دریافت کئے، تو فرمایا کہ ''نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو، لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے، اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے''(۱)۔

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں (۲)؟'' منسوخ کر دیا، واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی، قوموں کے رسوم وآداب اور اتیکیٹس اسی اصول پر قائم ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ بہ ظاہر اخلاقی امور ہر شخص کے پرائیویٹ اور نج کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نفع ونقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے، مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں، ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

(۱) یہ دونوں حدیثیں ترمذی کتاب التفسیر تفسیر سورۂ مائدہ میں ہیں ص ۴۹۸، ۴۹۹ (۲) سفر تکوین ۴-۹۔

چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے، ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کی مجلس میں فرمایا کہ ”بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے علما نے منع کیا، لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے، صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داوٗدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت ان پر لعنت کی“، اس کے بعد آپ ﷺ سنبھل کر بیٹھ گئے، اور فرمایا ”نہیں! جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑ و اور اس کو حق پر نہ جھکا دو۔“ (۱)

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم۔

اس کے چند شرائط: لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کر دے گا، یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے، قرآن نے کہا ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (بقرہ:۲-۴۴)　　کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے، خود آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (نحل:۱۶-۱۲۵)　　تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ:۲۰-۴۴)　　تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی:

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا. (نساء:۴-۶۳)　　اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات۔

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لئے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کے بہ جائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

---

(۱) جامع ترمذی تفسیر مائدہ ج ۲ ص ۱۳۵۔

امن وامان کا قائم رکھنا، امام کے ہاتھ میں ہے، اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوج دارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لئے تنفیذی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لئے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت: یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے، اس سے واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق وتفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے، کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت وکیفیت کی جستجو کرے، یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ

ع محتسب را درونِ خانہ چہ کار

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا، لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے، اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا، اس لئے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے، جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے، لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادِ تند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے، اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کو ظاہر فرمادیا ہے کہ انما الاذن لاجل الرویة یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لئے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے (۱)۔

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے، یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ

(۱) بخاری کتاب الاستیذان باب الاستیذان ج ۲ ص ۹۲۲ و مسلم کتاب الادب باب تحریم النظر فی بیت غیرہ ج ۲ ص ۲۳۶ و ترمذی ابواب الاستیذان باب من اطلع فی دار قوم الخ ج ۲ ص ۱۰۰۔

وناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے، چنانچہ وحیِ محمدی ﷺ نے اسی لئے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور سے ممانعت کی، فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ. (حجرات:۴۹-۱۲)

اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو، کہ بے شک بعض گمان گناہ ہے، اور نہ کسی کا اندر کا بھید ٹٹولا کرو، اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو، بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، سو تم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے جسم کی حفاظت نہیں کرسکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کرسکتا، اس غیبت کی ایسے قابل نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرتاً گھن آجائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لئے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ اس شخص کی، جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہوسکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہوتی ہے جو ایک مسلمان کی شانِ ایمان کے شایاں نہیں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھروگے تو ان کو برباد کردو گے'' (۱)۔

غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں۔

توسط اور اعتدال: آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گذر چکا تھا، اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔

عدل وانصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان ورفق وملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوش نما بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب النھی عن التجسس ج۲ ص ۶۷۰۔

حضرت موسیٰ کی شریعت مجسم عدل ہے، اس میں احسان و درگذر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے (۱)، اسی طرح حضرت عیسیٰ مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، ان کی شریعت میں عدل وانصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے (۲)، حضرت موسیٰ کی شریعت نے دنیا کے لئے عدل وانصاف کے جو اصول قائم کردئے تھے، اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

''تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت (۳)، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کردو، جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑ لے اس کو چادر بھی دے دو، جو شخص تم کو ایک میل تک بے گاری پکڑ لے جائے، اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ، جو تم سے مانگے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے، اس کو واپس نہ کرو، تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو'' (متی، باب ۵ آیت ۳۸)

حضرت عیسیٰ سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا، وہ حضرت موسیٰ کا قانون تھا، جو بالکل عدل وانصاف پر مبنی تھا، لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ کی زبانِ مبارک سے سن رہی تھی، وہ سراسر اخلاق رحمت اور احسان تھا، لیکن اسلام نے عدل واحسان دونوں میں امتزاج پیدا کر کے دنیا کے نظامِ حکومت کو کامل تر کردیا:

إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (نحل:۱۶-۹۰) — بے شبہہ خدا عدل اور احسان (دونوں) کا حکم دیتا ہے۔

یہ ایک اصولی تعلیم تھی، جس نے شریعتِ موسوی وعیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے۔

عدل اور احسان: ''عدل اور احسان'' کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لئے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے، قانون کی بنیاد درحقیقت ''عدل'' پر ہے، ''عدل'' کے معنی برابر کے ہیں، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے، اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے، یہ عدل ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کردینا اور درگذر کرنا یہ احسان ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اس نے دیا ہے یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے اور احسان ہر شخص کے ہاتھ

(۱) یہود کی سنگ دلی کے سبب سے (۲) یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لئے (۳) یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے، قانونِ عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے، اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے، اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے، اس لئے قانون کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لئے توراۃ کے قانونِ عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لئے قابلِ عمل نہیں رہا، خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن وامان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے، اس لئے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے، اس لئے اخلاق کو قانونِ عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور وفکر اور احتیاط کی ضرورت ہے، جو شریعتِ محمدی ﷺ میں پوری طرح برتی گئی ہے، کیوں کہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی۔

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے، بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں، جن کے لئے معاف کر دینا، درگذر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے اور بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تند خو پیدا ہوئے ہیں، جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے، ان کے لئے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے اور ”برائی، برائی کے بہ قدر“ کے اصول پر عمل کرنے کے لئے ان کو رضامند کر لیا جائے، اس لئے ایک عالم گیر شریعت کے لئے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لئے آئی ہو، عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق: اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور برائیوں کے انسداد کے لئے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق اور گو ان دونوں کا منشا ایک ہی ہے، مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں، اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے، جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے، قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے، مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا، جو

انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لئے ہر شخص کو بہ زور مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اس کے ذریعہ عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیتاً نہیں ہوسکتا، توراۃ محض قانون ہے، اورانجیل محض اخلاق، اسی لئے یہ دونوں الگ الگ امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لئے پوری طرح کافی نہیں، آنحضرت ﷺ ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل واحسان اور قانون واخلاق دونوں کو جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول شریعتِ محمدی ﷺ میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنادیا، بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کردی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچادیا۔

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہ راست دوسروں تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت میں رکھا، مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا، چنانچہ ان جرائم کے لئے قرآن نے سزا مقرر کی ہے، جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جاسکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیلِ نفس کے متعلق تھیں ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا، مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد وغیرہ، اس طرح شریعت محمدی ﷺ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے، قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے، لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کردے، بلکہ برائی کے بہ جائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے، اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانونِ انتظام وعدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لئے وہ نسلِ انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشو ونما کی پوری طرح متکفل ہے، وہ عدل وانصاف کے بہ زور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے، اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں، وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے، بلکہ وہ جسم وجان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے۔

عفو اور انتقام: موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علاحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے، اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں، لیکن اگر وہ قانونِ محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدی ﷺ کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہہ پیش نہ آتا، معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے، اس کا حکم ہے:

''اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا...... اور اگر کوئی اپنے ہم سایہ کو چوٹ لگائے، سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت''

(احبار ۲۴-۷ اخروج ۲۱-۱۲ گنتی ۳۵-۳۱- استثنا ۱۹-۱۱-۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے، اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے:

''تم سن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے دہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے'' (متی ۵-۳۸)

لیکن اس سرتا پا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کسی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے، عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں۔

۱- اوپر جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کئے گئے ہیں، اس کی نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (بقرہ:۲-۱۷۸)	اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا، آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا، اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (بقرہ:۲-۱۷۸)	تو اگر اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو دستور کے مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی، تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے)

اس (معافی یا خون بہالے لینے) کے بعد پھر زیادتی
کرے تو اس کے لئے دکھ کی سزا ہے۔

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے باوجود ان کے جذبہ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چوں کہ توراۃ کے حکم میں خوں بہالے کر معافی کی دفعہ نہ تھی، اس لئے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خوں بہا لینے کے بعد انتقام لینے پر عذاب الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یک جا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ . وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ . (مائدہ:۵-۴۵،۴۶)	اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں، اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا، اور اس کو انجیل دی، جس میں رہنمائی اور روشنی ہے، اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے، اور جو پرہیزگاروں کے لئے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔

۲۔ یہ فوج داری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے، مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے، فرمایا:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (بقرہ:۲-۲۷۹)	اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.

(بقرہ:۲-۲۸۰)

اور اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشایش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو۔

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ.

(نحل:۱۶-۱۲۶)

اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہو اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت بہتر ہے۔

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ. وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ○

(شوریٰ:۴۲-۳۹،۴۰)

اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو، تب وہ بدلہ لیتے ہیں، اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے، وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں، لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں، جتنا ان پر کیا گیا، کیوں کہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے جیسا کہ توراۃ میں بیان ہوا ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (وَاَصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کی جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے، اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن وامان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے، حالاں کہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے، اس لئے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظامِ ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لئے آنحضرت ﷺ ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے، اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجرا میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر وغریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے، دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا، تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کے لئے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجرا کے وقت حکم ہوتا ہے:

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نور:۲۴-۲)

اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گنہ گاروں پر ترس نہ آئے، اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے۔

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لئے اس گناہ کی سزا دنیا ہی میں دے دینا درحقیقت اپنے گنہ گار بھائی پر احسان کرنا ہے، اس لئے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر وغریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا ''اے لوگو! تم سے پہلے قومیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے، خدا کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا (۱)''۔

دوسری طرف عفو کا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا، الّا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے (۲) تو اس کو (قانوناً) سزا ملی ہو''، یہ عمل تھا تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ''میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا، لیکن یہ کہ اس میں آپ ﷺ نے معاف اور

(۱) صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود باب کراھۃ الشفاعۃ فی الحد ج۲ ص۱۰۰۳ (۲) ایضاً کتاب الحدود باب اقامۃ الحدود والانتقام لحرمات اللہ ج۲ ص۱۰۰۳۔

درگذر کرنے کا مشورہ دیا(۱)، یعنی قصاص کے بہ جائے بالکل معافی یا دیت (زرتاوان یا خون بہا) لے کر معاف کردینے کو فرمایا، معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہؓ سے فرمایا ''آپس میں گناہوں کو معاف کردیا کرو، لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہوجائے گی، (۲)''، یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہوجائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے، تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے، چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سورہے تھے، ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی، وہ پکڑا گیا، اور عدالتِ نبوی ﷺ میں پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے آکر عرض کی کہ ''یارسول اللہ ﷺ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لئے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کردیتا ہوں''، فرمایا کہ ''میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہیں یہ کرلیا (۳)''۔

یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانونِ محمدی ﷺ، موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفو و درگذر کی تعلیم: اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گذرتی ہے، وہ عفو، درگذر، ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے، لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت وجلالت کا کتنا اعلا اور ناقابل تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے، تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ ''تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ وہ چڑھ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ	اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہو
فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام: ٦-١٠٩)	کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے، پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم وستم اور گالی

(۱) ابوداؤد کتاب الدیات باب الامام یامر بالعفو فی الدم ص ٦١٨ ونسائی کتاب الدیات باب الامر بالعفو عن القصاص ج ۲ ص ۲۱۲ (۲) ابوداؤد کتاب الحدود باب العفو عن الحدود مالم تبلغ السلطان ص ٦٠١ (۳) ابوداؤد کتاب الحدود باب فی من سرق من حرز ص ٦٠٣۔

گلوج پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ. وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. (اعراف: ۷-۱۹۹، ۲۰۰)

معاف کرنے کی خو پکڑ اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھارے، (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ، وہ ہے سنتا جانتا۔

سکون کی حالت میں عفو و درگذر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے، صحابہؓ کی تعریف میں فرمایا:

وَإِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ. (شوریٰ: ۴۲-۳۷)

اور غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔

نیکوکاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (آل عمران: ۳-۱۳۴)

اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے، فرمایا:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ. (شوریٰ: ۴۲-۴۳)

اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔

اس برداشت اور عفو کو وحیِ محمدی ﷺ نے اپنے الفاظ میں "عزم" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جو خاص انبیا اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے، فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف: ۴۶-۳۵)

اور برداشت کر جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے، فرمایا:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ○ (لقمان: ۳۱-۱۷)

اچھی بات بتا اور بری بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے، فرمایا:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○ (آل عمران: ۳-۱۸۶)

اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا ہے اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ (جاثیہ: ۴۵-۱۴)

(اے پیغمبر) ایمان والوں سے کہہ کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ یہ وہی ہیں جو کافر و مشرک ہیں، اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بے زاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگذر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے:

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا. (نساء: ۴-۱۴۹)

اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو یا چھپا کر کرو یا کسی برائی کو معاف کرو تو یہ مسلمان کی شان ہے، کیوں کہ خدا معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

یعنی جب گنہ گاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہئے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی اور درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہئے، اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے:

وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. (نور: ۲۴-۲۲)

اور چاہئے کہ معاف کریں اور درگذر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کرے گا، اس میں عفو ودرگذر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔

برائی کی جگہ نیکی: عفو ودرگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، اس تعلیمِ ربانی پر عمل کرنے والوں کا نام خدا نے صابر اور ذو حظ عظیم ''یعنی بڑا خوش قسمت'' رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے، فرمایا:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ. وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ.

(حم السجدہ:۴۱-۳۴،۳۵)

نیکی اور بدی برابر نہیں تو برائی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ناتے دار دوست اور یہ بات ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے ''بڑی خوش قسمتی'' سے تعبیر کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، پھر دوسری جگہ فرمایا، مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو، کیوں کہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہئے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے:

اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ. وَقُلْ رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ. وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ.

(مومنون:۲۳-۹۶ تا ۹۸)

مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے، ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے، مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے، فرمایا:

وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ.

اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ (رعد:۱۳-۲۱)

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لئے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں، اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں، ان ہی کے لئے ہے پچھلا گھر، ہمیشہ رہنے کے باغ۔

ان سے کہا جائے گا:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ○ (رعد:۱۳-۲۴)

تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا پچھلا گھر۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارتِ غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے اور نہ خیرات کا اور نہ خوف خدا کا، صرف ایک صبر کی جزا کی خوش خبری ہے، علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے، ایک اور آیت میں نو مسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دل آزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں، اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں:

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ. (قصص:۲۸-۵۴،۵۵)

وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہیں تو اس سے درگذر کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے کام ہیں اور تمہارے لئے تمہارے کام، سلامت رہو، ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے، نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگذر کرتے ہیں، بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں

ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو، بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو(۱)''، ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آ کر عرض کی کہ ''اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں، میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں، میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں''، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو، یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی''(۲)، حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، یہ نہیں بلکہ اپنے کو پرسکون اور مطمئن رکھو، لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو''(۳)۔

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کارانہ معاہدوں اور پرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو یہی ہدایت ہوئی:

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (مائدہ:۵-۱۳)	اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو ان کو معاف کر اور ان کے قصور سے درگذر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور ان کے قصوروں سے درگذر کرنا، اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوش خبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری بحوالہ مشکوۃ باب البر والصلة ص ۴۱۹ (۲) صحیح مسلم بحوالہ مشکوۃ باب البر والصلة ص ۴۱۹ (۳) جامع ترمذی کتاب البر والصلة باب ماجاء فی الاحسان والعفو ج ۲ ص ۲۱ (غریب)۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظامِ حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصولِ قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظامِ حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جاسکتا لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی، ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلا سے اعلا مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے، لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لئے اسی قدر کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے، جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں، موقعِ واردات کا سراغ دیتے ہیں، مالِ مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں وغیرہ وغیرہ، بہر حال تمدنی نظام حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظامِ حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی، تمدن کے زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے، اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری: مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جاسکتی ہے، اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جاسکتا ہے، مثلاً اصولِ شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، معاملات میں، اخلاق میں، جو چیزیں ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھیں، ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی اور جو چیزیں جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھیں، ان کی ترغیب دی، لیکن امر و نہی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے، اس بنا

پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے، جس سے برائیوں کا تمام تر سدِ باب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کرلیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصا کیا ہو اور عام انسانوں کے لئے کھول کران کو اچھی طرح بیان کردیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کردیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجایش نہ رہے، اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری، اور انضباط ہے، یعنی اسلام نے اپنے اصول واحکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہوگیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہوگئے ہیں، اس کے بہ خلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا ام الاصول ہے، لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی، اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہوگیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل واسباب اور عواقب ونتائج کی تحدید کی اور ان کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی، اور عرب کے تمام بت توڑ دئے جاتے، لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا، جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کرسکتی تھیں، تصویر بہ جائے خود کوئی بری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اس لئے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا، کسی کی مدح میں غلو واغراق اگرچہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے، تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ وطاقت میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہوسکتا ہے، اسلام اپنے عالم گیر اثر کی وسعت کے لئے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چوں کہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی تھی، جس نے اممِ قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کرلی تھی، اس لئے آنحضرت ﷺ نے برسر منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی:

لاتطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم فانما انا عبدہ فقولوا عبد اللہ ورسولہ(۱)

میری شان میں مبالغہ نہ کرو، جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان میں کیا، میں تو خدا کا بندہ ہوں تو کہو کہ خدا کا بندہ اور رسول۔

---

(۱) بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ عزوجل وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ الخ ج۱ص۴۹۰۔

یہ ایک کلی حکم تھا اور آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے، اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا اور کوئی بات سوال وجواب کے لئے باقی نہیں رکھی، یہی معنی اس تکمیل کے ہیں، جس کے لئے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے:

۱- تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

۲- ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

۳- نرمی وگرمی، عاجزی وبلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اوران کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ: یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنا لی گئی ہے اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے، حضرت موسیٰؑ کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکامِ عشرہ کی ہے، یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے، ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت، اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے، باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں، جو حسب ذیل ہیں، (دیکھو خروج باب ۲۰ آیت ۱۲ تا ۳۰)

توراۃ کے اخلاقی احکام:

۱- تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔

۲- تو خون مت کر۔

۳- تو زنا مت کر۔

۴- تو چوری مت کر۔

۵- تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

۶- تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے، اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آ گئی ہیں، یعنی مسافر، بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، پھر احبار باب ۱۹ میں ان ہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے:

۱- تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

۲- تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

۳- تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

۴- تو اپنے پڑوسی سے دغا بازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہئے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

۵- تو بہرے کو مت کوس، تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے، اندھے کے آگے مت رکھ۔

۶- تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

۷- تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

۸- تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

۹- تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ ان کی طرف سے کینہ رکھ۔

۱۰- تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے، اٹھ کھڑا ہو اور بوڑھے مرد کو عزت دے۔

۱۱- اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے تم اس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو جیسے وہ جو تم میں پیدا ہوا ہے، بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو، جیسا آپ کو کرتے ہو۔

۱۲- تم حکومت کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں، بے انصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام: انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے، حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی، یہ حقیقت جس طرح احکام

میں نظر آتی ہے، اخلاق میں بھی جھلکتی ہے، حضرت عیسیٰ کی اخلاقی تجدید واصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی توراۃ ، حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت سلیمانؑ کے امثال اوردوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اورجن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے،ان کو یک جا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا، اس مشہور اخلاقی وعظ میں بہ ترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں:

دل کی غریبی ،غم گینی ،حلم وبردباری ،راست بازی ،رحم دلی ،پاک دلی ،صلح جوئی ،صبر ،عفو ودرگزر ،پاک دامنی ،قسم کھانے کی ممانعت ،ظالم کا مقابلہ نہ کرنا ،قرض معاف کرنا ،دشمنوں کو پیار کرنا ،ریا کی ممانعت ،توکل ،عیب نہ لگانا ،جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ،ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔

یہ اخلاقی تعلیمات بیش تر ان ہی لفظوں کے ساتھ جوانجیل میں ہیں ،بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں ،اور حضرت عیسیٰ کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح ومعنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا: محمد رسول اللہ ﷺ کے بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں ،اس لئے آپ ﷺ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا ،بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا گیا ،اس لئے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں ،یا پائی جانے والی تھیں ،ان سب کو استقصا کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کھول کر بیان کیا گیا ،اوران کے حصول کی تاکید کی گئی ،گذشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا ،یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی ،آنحضرت ﷺ کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصا کیا اوران کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا ،ذیل میں ،ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں ،جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست: سچ بولنا ،جھوٹ کی برائی ،علم بے عمل کی مذمت ،عام عفو ودرگذر ،توکل ، صبر ،شکر ،حق پر استقامت ،خدا کی راہ میں جان دینا ،سخاوت اور خیرات کا حکم ،بخل کی برائی ،اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت ،میانہ روی کی تاکید ،عزیزوں ،قرابت داروں ،یتیموں ،مسکینوں اور پڑوسیوں

کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں، اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر وغرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ وخیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، نہ برے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہ گاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد واتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکلِ حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا، اولاد کشی، خودکشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال وجائداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی برائی، آنکھ، کان، اور دل کی باز پرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درگذر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل وانصاف، دشمنوں تک سے عدل وانصاف، صدقہ وخیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی، اُلاہنے کی مذمت، فسق وفجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقویٰ اور پاکیزگی، پاک بازی جتانے کی برائی، رفتار میں وقار ومتانت، مجالس میں حسنِ اخلاق، ضعیفوں، کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم وجان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت، شرم گاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمایش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثباتِ قدم، استقلال اور شجاعت وبہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال ودولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمایش، معاملات میں

سچائی اور دیانت داری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست: یہ وہ تعلیمات ہیں، جن کا ماخذ قرآن پاک ہے، ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت ﷺ کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر وتشریح میں احادیث میں مذکور ہیں، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کی بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہیں، جن میں سے ہر صفحہ میں ۳۷ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نوسو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب وعنوانات میں منقسم ہیں، ان میں بعض مکرر باتیں بھی ہیں، تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی ونفسانی کیفیات وحالات کا کوئی ایسا جز نہ ہوگا جو داعیٔ اسلامؐ کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری، جامع ترمذی، اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔

صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہم سایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل وعیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجت مندوں کی امداد، اندھوں کی دست گیری، عام انسانوں کے ساتھ ہم دردی، قرض داروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گذاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت وعیادت، رشک وحسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت وبہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر وامام کی اطاعت، مداومتِ عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم وحیا، حلم ووقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفوودرگذر، صبر وتحمل، حسب ونسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہونا، دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لئے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق ونرمی، قناعت اور استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغل خوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض وکینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع

وخاک ساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پر مدح وستایش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبر وغرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفسِ انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل وانصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غم خواری وغم گساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضا، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت اور دورخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خواری، زنا کاری اور چوری کی ممانعت، طہارت وصفائی، دوست واحباب کی ملاقات، سلام وتحیت، مصافحہ ومعانقہ، دیگر آدابِ ملاقات، آدابِ مجلس، آدابِ طعام، آدابِ لباس، آدابِ نشست وبرخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب واخلاق وسلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصا: انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے، اس کے لئے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں، کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے، اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصا کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیئے جائیں، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اس کی توضیح کے لئے امر ونہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ وخیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے، لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے دونوں کو یک جا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جز کی تفصیل کر دی، توراۃ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے۔ شریعت محمدی ﷺ نے اس کے

متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری پوری تعیین کردی، وہ اجناس مقرر کردئے جن میں عشر یا زکوۃ واجب ہے، ان کی تحصیل کا طریقہ بتادیا، ان کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کردی، اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ، بلکہ یہ کہا:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (بقرہ:۲-۲۱۹)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہہ دے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو، تو یہ تمہارے کمالِ خلق کی دلیل ہے، انصار جنہوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دور کیں، ان کی تعریف میں خدا نے فرمایا:

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر:۵۹-۹)

وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو حاجت ہو۔

صحابہؓ کی مدح میں فرمایا:

يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا○ (دھر:۷۶-۸)

خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم، اور قیدی کو کھانا کھلادیتے ہیں۔

قرآن پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔

اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں، جو سڑی، گلی، خراب اور نکمی ہو، قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی دنائت اور آلودگی کو ظاہر کرتا ہے، فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ. (آل عمران:۳-۹۲)

تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک اس میں سے تم نہ خرچ کرو، جو تم کو محبوب ہے اور جو بھی تم خرچ کرو خدا کو اس کا علم ہے۔

پھر فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ

اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو، اس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لئے زمین سے نکالتے ہیں، اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دو اور اس میں سے خراب چیز دینے

اِلَّا اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْہِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ. (بقرہ:۲-۲۶۷)

کا قصد بھی نہ کرو کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کرلو اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ ''وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے''، یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی، اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے کہ وہ تو ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پرواہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے، اس لئے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔

سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں، جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل وعیال، دست نگر، عزیز وقریب، پھر دوسرے محتاج ومسکین اور یتیم ومسافر:

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ. (بقرہ:۲-۲۱۵)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں، کہہ دے جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو، وہ ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لئے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو، اللہ اس سے واقف ہے۔

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے، لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو، فرمایا، مزدوری کرے، اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے کچھ محتاجوں کو کھلائے، صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا تو غم رسیدہ حاجت مندوں کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کرسکے تو نیکی کی تعلیم دے، اور اگر یہ بھی نہ کرسکے تو برائی کرنے سے بچے، یہ بھی صدقہ ہے'' (۱)، دوسرے موقع پر فرمایا ''اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے'' (۲)، غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ احسان اس پر جتاؤ، نہ اس سے اس

(۱) الادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقة ص۳۶ مصر (۲) جامع ترمذی ابواب البر والصلہ باب صنائع المعروف ج۲ ص۱۷۔

کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمایش مقصود ہو کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے، آنحضرت ﷺ کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا:

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ○ (مدثر:۷۴-۶)

اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی:

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ:۲-۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے، جو لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی ہی نیکی بہتر ہے:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ أَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ. (بقرہ:۲-۲۶۳)

اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے احسان جتا کر لینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے، اور خدا بے نیاز اور بردبار ہے۔

ریا اور نمایش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو، اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصد ہو تو دکھا کر کے بھی دے سکتے ہو:

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ. (بقرہ:۲-۲۷۱)

اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمہارے لئے سب سے بہتر ہے اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کردے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ:۲-۲۷۴)

جو لوگ اپنا مال رات اور دن چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی خوشی ہونی چاہئے، جبر و کراہت سے نہ ہو کہ یہ منافقت کی نشانی ہے:

وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ. (توبہ:۹-۵۴)

اور وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر۔

صدقہ و خیرات پکے دل سے اور صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے:

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ (بقرہ:۲-۲۶۵)

اوران کی مثال جواپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کراوراپنا دل پکا کر کے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود خدا ہو:

وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ. (بقرہ:۲-۲۷۲)

اورتم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور جو خیرات کروگے وہ تم کو پوری ملے گی، تمہارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ: احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کردیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیتاً محفوظ نہیں رہ سکتے، مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا، لیکن اس کی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے، لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے، جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے، لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کرسکتا:

قال رسول اللہ ﷺ لعن اللہ الخمر وشاربها وساقيها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة اليه(۱)

آپ ﷺ نے فرمایا، خدا شراب پر اس کے پینے والے پر اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے اپنے لئے نچوڑنے والے پر، اس کے لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے لعنت کرتا ہے۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاشربہ باب العصیر للخمر ص ۵۱۷۔

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے، سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے، عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا، قرآن مجید میں حرمتِ شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کی تعیین فرمادی:

قال رسول الله ﷺ ان من العنب خمرا وان من التمر خمرا وان من العسل خمرا وان من البر خمرا وان من الشعير خمرا (۱)

آپ ﷺ نے فرمایا، انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے بھی اور جو سے بھی۔

قال سمعت رسول الله ﷺ يقول ان الخمر من العصير والزبيب والتمر والحنطة والشعير والذرة، وانى انهاكم عن كل مسكر (۲)

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ شراب انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔

عرب کے مختلف حصوں میں ان ہی چیزوں کی شراب بنتی تھی، اس لئے یہ تعریف عرب کے تمام اصنافِ شراب کو حاوی تھی، لیکن اسلام ایک عالم گیر مذہب تھا اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور تحدید ان کو شامل نہ ہو، اس لئے آپ ﷺ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو تمام اقسامِ شراب پر حاوی تھی:

كل مسكر خمر وكل مسكر حرام (۳)

ہر نشہ آور چیز شراب ہے، اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

كل شراب اسكر فهو حرام (۴)

ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ حرام ہے۔

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لئے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمتِ شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاشربہ باب الخمر مما ھی ص ۵۱۷ (۲) ایضا ۵۱۸ (۳) ابوداؤد کتاب الاشربہ باب ماجاء فی السکر ص ۵۱۸ و صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب بیان کل مسکر خمر ج ۲ ص ۱۷۷ و احمد ج ۱ ص ۲۸۹ و ترمذی کتاب الاشربہ باب ماجاء کل مسکر حرام ج ۲ ص ۸ و نسائی باب الخمر لکل مسکر من الخمر ج ۲ ص ۲۷۶ (۴) ابوداؤد باب ماجاء فی السکر ص ۵۱۸، احمد ج ۱ ص ۲۷۴، و بخاری کتاب الاشربہ باب الخمر من العسل ج ۲ ص ۸۳۷، و مسلم کتاب الاشربہ باب بیان ان کل مسکر خمر ج ۲ ص ۱۷۷۔

جائے کہ نشہ نہ آئے اس لئے فرمایا:

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام (۱)

جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں، تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کی بھی ممانعت فرمائی:

نھی رسول اللہ ﷺ عن کل مسکر و مفتر (۲)

آنحضرت ﷺ نے ہر نشی و مخدر چیز سے منع فرمایا ہے۔

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی منشی چیزیں استعمال کریں، جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی جس کو داوی کہتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا:

یقول لیشربنّ ناس من امتی الخمر یسمونھا بغیر اسمھا (۳)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔

ان کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی:

نھی عن الدباء والحنتم والمزفت والنقیر (۴)

آپ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی، منع فرمایا۔

لیکن چوں کہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لئے آپ ﷺ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرما دیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی، چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمت خمر کے بعد وہ بے کار چیز ہوگئی، حضرت ابوطلحہ نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ

(۱) ابوداؤد کتاب الاشربہ باب مذکور ص ۵۱۸ (۲) ابوداؤد کتاب الاشربہ باب ماجاء فی السکر ص ۵۱۹
(۳) ابوداؤد کتاب الاشربہ باب فی الداوی ص ۵۱۹ (۴) ابوداؤد کتاب الاشربہ باب فی الاوعیۃ ص ۵۱۹۔

کیوں نہ بنالیا جائے، لیکن آپ ﷺ نے اجازت نہ دی (۱)۔

ایک بار دیلم حمیری نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے ہیں، اس لئے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ ﷺ نے فرمایا، کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے، انہوں نے کہا "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا تو اس کو چھوڑ دو، انہوں نے کہا، لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے، ارشاد ہوا کہ "اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جہاد کرو" (۲)۔

سود کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ: اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی "ناروا نفع" سے لوگوں کو روکا ہے، تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے، لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا، اس ظلم میں لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں، ان سب کو شریکِ جرم ٹھہرایا:

لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوٰ وموکلہٗ وشاھدہٗ وکاتبہٗ (۳)	آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے، اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔

رشوت کی حرمت میں استقصا:

لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی (۴)	آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصا، اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے کیوں کہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے، اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لئے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے، اس چیز کا کلیتاً قلع وقمع نہیں ہوسکتا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوری نرم وگرم اخلاق: مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی کہ اس نے حسن اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم میں کر دیا

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاشربہ باب ما جاء فی الخمر تخلخل ص ۵۱۷ اس سرکہ کے جواز اور عدمِ جواز میں فقہا کا اختلاف ہے۔ (۲) ایضاً باب ماجاء فی السکر ص ۵۱۸ (۳) ابوداؤد کتاب البیوع باب فی آکل الربوٰ ص ۴۷۳ (۴) ایضاً کتاب القضا باب فی کراھیۃ الرشوۃ ص ۵۰۴۔

تھا، یعنی تواضع ، خاک ساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غم گینی وغیرہ، منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی، حالاں کہ دنیا کے امن وسلامتی اور ترقی وخوش حالی کے لئے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے، جس قدر ایک مقام پر تواضع وخاک ساری کی ضرورت ہے، اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزتِ نفس کی حاجت ہے، جس طرح عفو ودرگذر بلند ہمتی کا کام ہے، اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے، محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لئے ضروری سہی، مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہئے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر: جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا و بے جا اعتراضات کے جو تیر برسائے اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے، وہ اسی لئے ہے کہ وہ صرف کمزوری ، عاجزی ، خواری، اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں، جن سے لوگوں میں عزم ، بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم، عزتِ نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہوسکتے ، وہ کہتا ہے:

> ”مسیحیت نے ہمیشہ کم زور، پست اور بوسیدہ اشیا کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائعِ انسانی کی تمام خوددارانہ قوتوں کا استیصال کردینا اپنا مسلک قرار دیا ہے، مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کردیا ہے“ (۱)۔

اسلامی اخلاق کا اعتدال: لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیحؑ کے ۵۷۵ برس بعد اس نبی آخرالزماں ﷺ کا ظہور ہوا ہے، جس نے مسیحی نظام اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کردی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کردیا، جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گذری تھی کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنا نے اعلا کی اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کرلی، مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی، جب تک اصلاح وتجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریتاً قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلاف استعداد: اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہیں ہے، جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو، تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں، اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں، انسانوں میں کمزور وپست ہمت بھی ہیں اور قوی وبلند حوصلہ بھی، خاک سار

(۱) نٹشے از ایم، اے، مگے، مترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم، اے، باب سوم ص ۷۶ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ۔

ومتواضع بھی ہیں اور مغرور وخوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بردبار بھی ہیں اور غضب ناک بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں اور پرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی، ظالم وزبردست بھی ہیں اور ذلیل وخوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لئے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہوسکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح وتندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسبِ ضرورت اصلاح: صحیح اخلاقی تعلیم وتربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کرکے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پرامید کرے، اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ خدا سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کرکے خدا سے مانگنے والا کردے، وہ ذلیل وخوار کو خوددار، اور خوددار کو غیر مغرور بنادے، وہ اچھی قوتوں کو نشو ونما دے اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم سے کم کردے۔

قوتِ غضب اور قوتِ شہوت میں تعدیل: قدیم فلسفۂ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے، قوتِ غضب اور قوتِ شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوت کا، اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونوں قوتوں کی افراط وتفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے سیکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے، غضب کی قوت اگر افراط وتفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات وکیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے، مثلاً خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثباتِ قدم، وقار، صبر وسکون، مطالبۂ حق، جد وجہد، سعی ومحنت، جہاد، پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی ہے تو تہور بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتلِ نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور

دنائت کے قالب میں ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے تو اس کو عفت کہتے ہیں، یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے، یعنی پاک دامنی، پرہیز گاری، جود وسخا، شرم وحیا، صبر وشکر، قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل واولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط وتفریط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس سے حرص وطمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک، وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق: مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط وتفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے، مسیحیت کے نزدیک نفس یہ دونوں قوتیں بذاتہٖ بری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بہ جائے خود بری نہیں ہیں، بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع ومحل برا ہوتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت غضب کو فنا کر کے ''دشمن کو پیار کرو'' اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو اور مفلس وغمگین بن کر زندگی گذار دو، بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انہیں ہدایت ملے اور خدا کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ، لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو، امام غزالیؒ کے بہ قول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصہ کے مٹانے والے کی نہیں، اس نے وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ (آل عمران ۳:......) کہا ہے، وَالْفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ نہیں (۱)۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں: دنیا میں علم وہنر، خوشی ومسرت، ولولہ وانبساط، رونق وترقی، جد وجہد، جو کچھ ہے وہ ان ہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں، اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط وتفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مر جائے، نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن وامان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم اور سعی ومحنت کے جوہر نمایاں ہوں، قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور خدا کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت وجنبش کا نام نہ رہے۔

---

(۱) احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۲۱ مطبوعہ مصر۔

مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے، بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزیں ہیں، اسی قدر وہ معائب بھی جوان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دنائت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، سستی، فاقہ زدگی بھی برے ہیں، اسلام نے اپنے پیرووں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے، اس نے جہاں ان کو رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ (فتح:۴۸-۲۹) (آپس میں رحم دل) اور اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (مائدہ:۵-۵۴) (مومنوں کے فرماں بردار) کی تعلیم دی وہیں اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ (فتح:۴۸-۲۹) (کافروں پر بھاری) اور اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ (مائدہ:۵-۵۴) (کافروں پر گراں) بننے کی بھی تعلیم دی، اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور ان کے فرماں برداروں کے حصہ میں ہے، وَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَلِرَسُوۡلِہٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (منافقونؔ:۶۳-۸)، مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا جب تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا، لیکی تاریخِ اخلاق یورپ کی دوسری جلد میں لکھتا ہے:

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر: ”لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے،......

......اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں و مناسب رہا، تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقیِ تمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں، خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمحِ نظر تھا، کسی طرح ترقیِ تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑسکتا تھا اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں، لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو جاتا ہے، اسی کو دیکھ کر متاخرین حکمائے اخلاق نے بہ جائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی اور دوسرے خودداری، انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی، بلکہ ان کے بہ جائے دنائت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں،

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں ان سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں''(۱)۔

اسلام اور بلند اخلاق: لیکن اس کے بالمقابل معلمِ اسلام علیہ السلام کی تعلیم جو کچھ ہے، اس کا اندازہ آپ ﷺ کے صرف ایک سبق سے ہوسکتا ہے، فرمایا:

ان اللہ یحب معالی الامور ویکرہ سفسافھا (۲)	بے شک اللہ معالیٔ امور کو پسند اور محقراتِ امور کو ناپسند کرتا ہے۔

''معالیِ امور'' سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام اور محقرات سے مراد چھوٹی اور ادنی باتیں ہیں، اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کے لئے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دنائت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔

اسی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کردینے کے لئے کافی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

المومن القوی خیر و احب الی اللہ من المومن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ماینفعک واستعن باللہ ولاتعجز وان اصابک شیئ فلا تقل لو انی فعلت کان کذا وکذا ولکن قل قدر اللہ وماشآء فعل فان لوتفتح عمل الشیطان (۳)	کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا ہے، اور ہر ایک میں بھلائی ہے، ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش کر اور خدا سے مدد چاہ، اس راہ میں کمزوری نہ دکھا، اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ ''اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا'' بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کردیا تھا، اور جو چاہا اس نے کیا، کیوں کہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔

تقدیر، توکل، صبر اور شکر: یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، توکل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عباداتِ قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جاچکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لئے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، پرامیدی، استقلال اور ثباتِ قدم پیدا ہو، مسلمان

(۱) فصل ۱۱ص۱۲۴مترجمہ عبد الماجد دریابادی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۱۹ء (۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج۸ص۱۸۸ بروایت طبرانی (۳) صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ ج۲ص۳۱۵۔

میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہئے، پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہئے، اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر وغرور کے بہ جائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے اور یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ اسی کے فضل وکرم سے ہوا اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بہ جائے صبر وثبات پیدا ہونا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ خدا کا منشا یہی تھا، (یہی تقدیر ہے)۔

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ . إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ.

(آل عمران:۳-۱۵۹،۱۶۰)

جب تو پکا ارادہ کر لے، پھر خدا پر بھروسہ کر، بے شک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے، اگر خدا تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں، اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے، خدا ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِيْ أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللهِ يَسِيْرٌ . لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ وَاللهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. (حدید:۵۷-۲۲،۲۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، یہ اس لئے تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کرو اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر وشکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنائت کے لئے نہیں، بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے ہے، اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے، ان کو مشکلات میں خدا کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی:

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. (بقرہ:۲-۲۵۰)

اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر وثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگوں پر فتح یاب کر۔

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا:

وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ. وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

(آل عمران:۳-۱۴۶،۱۴۷)

اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی تو خدا کی راہ میں جو مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ ست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے اور خدا ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا نہ تھا، لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.

(آل عمران:۳-۲۰۰)

اے وہ جو ایمان لائے، ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو تا کہ کامیاب ہو۔

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی، اور مشکلات میں صبر وثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے، یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے، اسی طرح سطوت اور بہادری وحکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں کو پیار کرو: مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو، اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، لیکن اہلِ معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے، یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسروں (۱) نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے، تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو، مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے، جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاقِ محمدی ﷺ نے اس کے بہ جائے وہ تعلیم دی جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے، اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے، یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو، برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بددعائیں دیں، ان کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں، ان کو معاف کرو، اور جو

(۱) اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی۔

تم پر ظلم کریں، ان کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا:

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ. (مائدہ:۵-۸)

اے ایمان والو! خدا کے لئے کھڑے ہو جایا کرو، انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل وانصاف کرنے سے باز نہ رکھے، انصاف کرو کہ انصاف کرنا پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے اور خدا سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ. وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (حم السجدہ:۴۱-۳۴،۳۵)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کو بھلائی سے دفع کرو، تو دفعتاً وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا اور اس پر عمل کی توفیق انہیں کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور انہیں کو یہ سعادت ملتی ہے، جو بڑی قسمت والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو خدا کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

۱- اس آیتِ پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

۲- اس آیتِ پاک میں جس نیکی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے، جو تمہارے دشمن ہیں، کیوں کہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

۳- دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاق محمدی ﷺ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے۔

۴- دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابن عباسؓ جو صحابہؓ میں بڑے مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں (۱):

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر حم السجدہ ج ۲ ص ۷۱۲ و ابن جریر ج ۲۴ ص ۶۸ مصر۔

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ وغضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر حلم اور عفو ودرگذر کا حکم دیا ہے، وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے پنجے سے چھڑائے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا"۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے، گالی دی، وہ سن کر چپ رہے، اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے، یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ فوراً اٹھ گئے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ مجھ سے خفا ہوئے، فرمایا، اے ابوبکر! جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا (۱)، آپ ﷺ نے فرمایا "صلہ رحم یہ نہیں ہے کہ صلہ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحم کرو، بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرے، اس کے ساتھ صلہ رحم کرو" (۲)، یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمتِ نبوی ﷺ میں آکر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے وہ بات بتائیے جس کے کرنے سے جنت مل جائے، آپ ﷺ نے اس کو چند باتیں بتائیں، من جملہ ان کے فرمایا، ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کر دو (۳)، اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہبی دشمن نہیں ہو سکتا، لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفو ودرگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے:

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ. (جاثیہ: ۴۵-۱۴)	(اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان کو جو خدا کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے، معاف کر دیا کریں، تاکہ خدا ایسے لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ "ریاکار فریسیوں" اور "سانپوں اور سانپوں کے بچوں" (۴)، والی مسیحیت کے واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی وواعظ میں ہے جس نے فاتح بن کر، مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں، بہ یک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا، جن

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی الانتصار ص ۶۷۱ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب لیس المکافی ج ۲ ص ۸۸۶۔ (۳) مستدرک حاکم کتاب المکاتب ج ۲ ص ۲۱۷ حیدرآباد دکن۔ (۴) انجیل متی ۲۳-۲۵-۳۳۔

میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا (۱)، جس نے اس کو معاف کیا، جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لئے اہل مکہ کا اشتہار وانعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا (۲)، جس نے خیبر میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا (۳)، جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا (۴)، جس نے حضرت حمزہؓ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا (۵)، جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا (۶)، جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا (۷)، جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ محو خواب تھا اپنے ایک تیغ بہ کف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کیا (۸)، جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی (۹)، جنہوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی، جس سے اس کے پاؤں خون آلودہ ہو گئے تھے، جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی (۱۰)، جس نے دشمنوں کے حق میں بددعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لئے نہیں بلکہ رحمت کے لئے آیا ہوں ﷺ (۱۱)، انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیز گاری) کی شان بتائی گئی:

اِلَّا الَّذِیْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْئًا وَّلَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ. (توبہ: ۹-۴)	لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا پھر انہوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت مقرر تک پورا کرو، اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

کفار و مشرکین سے عدم موالات: اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں،

(۱) صحیح بخاری کتاب المغازی باب فتح مکہ ج ۲ ص ۶۱۵ (۲) صحیح بخاری کتاب بنیان الکعبۃ باب الهجرة ج ۱ ص ۵۵۴ (۳) صحیح بخاری کتاب المغازی باب فتح خیبر باب الشاۃ التی سمت للنبی ﷺ ج ۲ ص ۶۱۰ و ذکر وفات نبوی ﷺ ایضاً ج ۲ ص ۶۳۷ (۴) صحیح بخاری کتاب المغازی فتح طائف ج ۲ ص ۶۱۹ (۵) صحیح بخاری کتاب المغازی باب فتح مکۃ ج ۲ ص ۶۱۵ (۶) کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشتہاریان فتح مکہ و اصابہ ذکر ہبار بن اسود ج ۶ ص ۲۷۹-۲۸۰ و زرقانی ج ۳ ص ۳۳۳ (۷) جامع ترمذی کتاب التفسیر سورہ فتح ج ۲ ص ۱۶۲ (۸) صحیح بخاری کتاب الجهاد باب تفرق الناس عن الامام ج ۱ ص ۴۰۸ (۹) ابن سعد غزوہ طائف مغازی قسم اول جز ثانی ص ۱۱۴ و تفسیر ابوحیان تفسیر سورہ فتح ج ۸ ص ۹۸ مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ (۱۰) فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۶ مصر باب احد (۱۱) صحیح بخاری مبعث النبی ﷺ ج ۱ ص ۵۴۳ و مشکوۃ اخلاق النبی ﷺ ص ۵۱۸ بحوالہ مسلم۔

جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے، حالاں کہ یہ بالکل علاحدہ چیز ہے، یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیرووں کو اس کے ان مخالفوں کے میل جول، رازداری اور رفاقت سے روک دے، جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کردینے کے درپے ہوں، خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں، اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیرووں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں، چنانچہ اس قسم کی آیتیں:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً (آل عمران:۳-۲۸)	ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں، تو جو ایسا کرے گا تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہیں، مگر یہ کہ تم اس سے بچاؤ چاہو۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (توبہ:۹-۲۳)	اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہی حد سے گذرنے والے ہوں گے۔

اسی موقع کی ہیں، ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہلِ حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی فطرتاً ان اہلِ باطل سے اسی قدر بے زاری اور علاحدگی ہوگی، جو اس حق کے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں، اس لئے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں، جو ''شہزادۂ امن'' کے اس اعلان کے ہیں:

''یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں، کیوں کہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے، وہ میرے لائق نہیں''۔ (متی کی انجیل باب ۱۰-۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گنہ گاروں کے ساتھ تھی، وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے، جب حجاز کے یہودیوں اور سرحدِ شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بہ ظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا، تو مدینہ کے منافقوں اور کمزوردلوں کی عاقبت بینی اور دوراندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں تا کہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دینِ اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہلِ کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ. وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ. يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ.

(مائدہ:۵-۵۱تا۵۴)

اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے وہ ان ہی میں ہے، اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے، تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں، اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، خراب گئے ان کے عمل، پھر رہ گئے نقصان میں، اے ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو خدا کا کچھ ہرج نہیں، اللہ اپنے دین کے لیے اور دوسرے لوگوں کو لائے گا، جن سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے، جو ایمان والوں کے فرماں بردار اور کافروں پر بھاری ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (مائدہ:۵-۵۷)

اے ایمان والو! اہل کتاب اور کفار میں سے ان کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں، اپنا رفیق نہ بناؤ اور خدا سے ڈرو اگر یقین رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں پوری تشریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کار، محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ. (آل عمران:۳-۱۱۸)

اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، جتنی تم کو تکلیف پہنچے، ان کو خوشی ہے، دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے، اور جو ان کے جی میں چھپا ہے، وہ اس سے زیادہ ہے، ہم نے تم کو باتیں جتا دیں، اگر تم کو عقل ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے، جس کی روک تھام کے لئے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے، سب سے زیادہ تصریح سورہ ممتحنہ میں ہے، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ. اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ. لَنْ تَنْفَعَكُمْ

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجو، اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی، منکر ہیں، وہ رسول کو اور تم کو اس لئے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے، اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری خوشنودی کی طلب میں نکلو تو تم ان کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو، اور مجھے خوب معلوم ہے، جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو، جو تم میں سے ایسا کرتا ہے، وہ سیدھی راہ بھولا ہے، اگر وہ (جن کو تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع سے پائیں، تو تمہارے دشمن ہوں، اور تمہاری تکلیف پہنچانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائیں،

اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ (ممتحنہ: ۶۰-۱تا۳)

اور برائی کے ساتھ اپنی زبانیں کھولیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ، تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنئے:

لَا يَنۡهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَلَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ. اِنَّمَا يَنۡهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قَاتَلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَاَخۡرَجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ وَظٰهَرُوۡا عَلٰۤى اِخۡرَاجِكُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ. (ممتحنہ: ۶۰-۸،۹)

خدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے، اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں، خدا انصاف والوں کو پیار کرتا ہے، وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے، جو تم سے مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں، اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں، جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا تو وہی بے انصاف ہوں گے۔

اس کے ساتھ یہ خوش خبری بھی سنادی کہ عن قریب تمہاری فتح ہوگی، اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی، فرمایا:

عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّجۡعَلَ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَ الَّذِيۡنَ عَادَيۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيۡرٌ (ممتحنہ: ۶۰-۷)

امید ہے کہ اللہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کردے، اور اللہ قدرت والا ہے۔

ان آیتوں کا مطلب ان کے شان نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے، ان ہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کرلینا چاہتے تھے، تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطبؓ بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لئے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کردیا کہ قریش خبردار ہو جائیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی، آپ ﷺ نے دو سواروں کو بھیجا کہ راستے سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں، وہ خط آیا تو آپ ﷺ نے حاطبؓ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جلدی نہ فرمایئے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں، لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں وہاں ان کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں، جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں،

میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی، جس کا مکہ والے لحاظ کرتے تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں تا کہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں، میں نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا، آپ ﷺ نے فرمایا، تم بدر والے لوگ ہو، خدا نے تمہارے گناہ معاف کئے ہیں، اس پر یہ ایت اتری:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا (ممتحنہ:۶۰-۱) اے ایمان والو! میرے اور (۱) اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہد عتیق میں بھی مذکور ہیں، زبور میں ہے:

''اے خدا تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا، پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیوں کہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں، اے خداوند کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا جو تیرا کینہ رکھتے ہیں، کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں، بیزار نہیں، میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں میں انہیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں'' (۱۳۹-۱۹-۲۲)

یشوع کے صحیفہ میں ہے:

''اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیہ سے لپٹو تو جو تمہارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گروہوں کو تمہارے سامنے سے دفع نہ کرے گا، بلکہ وہ تمہارے لئے پھندے اور دام اور تمہاری بغلوں کے لئے کوڑے اور تمہاری آنکھوں میں کانٹے ہوں گے، یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمہارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے''، (یشوع باب ۲۳-۱۲)

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں، جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گنہ گاروں سے علاحدہ رہنے کی نصیحت ہے:

وَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ كَمَا كَفَرُوۡا فَتَكُوۡنُوۡنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡهُمۡ اَوۡلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ (نساء:۴-۸۹)

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جس طرح انہوں نے کفر کیا، تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ خدا کی راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔

وَاِذَا رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ يَخُوۡضُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ

اور جب تو ان کو دیکھے کہ جو میری آیتوں کی شان میں لغو بکتے ہیں تو ان سے کنارہ کر لے، یہاں تک کہ وہ اس کے

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۲۶ تفسیر سورہ ممتحنہ۔

غَیْرِہٖ ۚ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ. (انعام:۶-۶۸)

سو اور دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ان گنہ گار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖۤ اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ (نساء:۴-۱۴۰)

اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے اور ان پر ہنسی ہوتے تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں، نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔

یہ احکام اس لئے ہیں تاکہ بری صحبت کا برا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں، جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں:

''میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بلکہ دنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں، یا لٹیروں، یا بت پرستوں سے نہ ملو، نہیں تو تمہیں دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا، پر میں نے اب تمہیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار، یا لالچی، یا بت پرستی، یا گالی دینے والا، یا شرابی یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا، بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا، ....غرض کہ تم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو'' (اول قرینتون ۵)

اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوے میں مت جتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کون سا ساجھا ہے، اور روشنی اور تاریکی میں کون سا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے، خدا کی ہیکل کو بتوں سے کون سی موافقت ہے.........اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ، اور جدا ہو، اور ناپاک کو مت چھوؤ (۲ قرینتون ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بے گانگی اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے، عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ. (توبہ:۹-۶)

اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اس کو تو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے، یہ اس لئے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔

کیا ایک جنگ جو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہوسکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک وکافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے، فرمایا:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۖ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَىَّ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ.
(لقمان: ۳۱-۱۵)

اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد کریں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان، اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر، اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا، پھر تم سب کو میری طرف آنا ہے، پھر میں تم کو جتاؤں گا جو تم کرتے تھے۔

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہوسکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع: اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں "منافقین" کہتے ہیں، بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو، اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں، وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کرلیں، یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں، اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جول سے روک دیا جائے اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز آجائیں، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امامِ وقت کو حاصل ہے، اس موقع کی دو آیتیں سورۂ توبہ میں ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ. يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۚ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ

اے پیغمبر ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا حالاں کہ انہوں نے یقیناً کفر کی بات کہی، اور اسلام کے

يَنَالُوا ۚ وَمَا نَقَمُوٓا إِلَّآ أَنْ أَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَإِنْ يَّتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَإِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا أَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ. (توبہ:۹-۷۳،۷۴)

اظہار کے بعد کفر کیا اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ نہ پا سکے اور انہوں نے عیب نہیں کیا لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کر دیا تو اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے لئے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ ان کو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہوگا، نہ مددگار۔

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں، اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں، تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں (۱) کے مقابلہ میں اپنی سختی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (توبہ:۹-۱۲۳)

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور یقین کرو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لئے ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلا کے موقع پر جب بعض منافق اہلِ بیت نبوی ﷺ میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:

يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ. (تحریم ۶۶:۹، التوبہ ۹:۷۳)

اے پیغمبر ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بازگشت کی کتنی بری جگہ ہے۔

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

---

(۱) تفسیر ابن جریر طبری ج ۱۰ ص ۴۶ مصر۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگ دلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں، اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں، اور وہ سورۂ فتح کی حسب ذیل آیت ہے، جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحم دلی کی تعریف ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح:۴۸-۲۹) محمد خدا کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں، اور آپس میں مہر و محبت رکھتے ہیں۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ ''وہ کافروں پر سخت ہیں'' اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی، اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد، اور شدتِ ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں، اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے، اس لئے محاورہ کے مطابق اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح:۴۸-۲۹) کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، ان سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمخشریؒ نے کشاف میں (ج۲ص ۱۳۱، ۱۸۵۹ء) ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، (ج۸ص۹۹ مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ)، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل (ج۲ص ۱۶۷ مطبوعہ مطبع احمدی ۱۲۷۸ھ) میں اس آیت کے وہی معنی قرار دئے ہیں، جو سورہ مائدہ کی اس آیت کے ہیں:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (مائدہ:۵-۵۴) فرماں بردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً سورہ ہود میں ہے:

يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (ھود:۱۱-۹۲) اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔

دوسری آیت میں ہے:

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (توبہ:۹-۱۲۸) تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔

لسان العرب میں ہے:

ورجل شديد قوى والجمع اشداء (جلد۴ص۲۱۸مصر) مرد شدید، یعنی قوی اور اس کی جمع اشدا ہے۔

قرآن پاک میں اَشَدُّ قُوَّةً ،اَشَدُّ خَلْقًا ،اَشَدُّ تَثْبِيْتًا ،اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے، دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لئے گئے ہیں:

اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ.	(طٰهٰ:۲۰-۳۱)	اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔
وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا.	(نبا:۷۸-۱۲)	اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔
وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ	(ص:۳۸-۲۰)	اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ	(محمد:۴۷-۴)	پھر مضبوط باندھو۔

شدید کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے، بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرامؓ کی صفت تھی، انہوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروانہ کی تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پرزور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا، ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی، ان کے تیروں کی بوچھار سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا پھر اس کو دو نہ کہا اور جس کی تصدیق کر چکے تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ:

سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران:۳-۱۵۱، انفال:۸-۱۲) — میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دوں گا۔

وہ بالآخر پوری ہوئی، اور فرمایا:

وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب:۳۳-۲۶، حشر:۵۹-۲) — ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب بٹھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ (انفال:۸-۶۰) — ان کے لئے تم سے جو طاقت ہو سکے اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو، کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے، اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا

مسلمانوں پر فرض ہے اور آنحضرت ﷺ نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، فرمایا جو شخص گھوڑا خدا کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے، وہ اس کے لئے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لئے باندھتا ہے، اس کے لئے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے باندھتا ہے، وہ اس کے لئے عذاب ہے(۱)، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ ﷺ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لئے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا منشا ذاتی وقومی نفرت اور بے زاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور خدا کے لئے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل وانصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیرووں کو نہیں روکا ہے۔

خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی: یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بے زاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی، انسان کے فطری جذبات ہیں اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں اور تمام جدوجہد انہی دو برابر کے جذبات کے نتیج ہیں، اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک وبد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بن جائے، اس لئے یہ نہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے، بلکہ جو ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علاحدہ کر دیا جائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ وغضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے، بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع ومحل متعین کیا جائے، چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خودغرضی اور شخصی نفع ونقصان کے لئے نہ ہو، بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہو، صلح وجنگ، دوستی ودشمنی، رضامندی وناراضی، اور محبت وعداوت جو کچھ ہو وہ خدا کے لئے ہو، **الحب فی اللہ والبغض فی اللہ**(۲)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجهاد باب الخیل لثلثة ج ۱ ص ۴۰۰ (۲) بخاری کتاب الایمان باب بنی الاسلام علی خمس ج ۱ ص ۶ ''ک ص''۔

یہ کہنا بہ ظاہر بہت خوش نما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی وناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناخوشی وناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی وناراضی کے موقع ومحل کی اصلاح کی جائے، یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے، وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بے زار بھی ہوگا، وہ نیکوں سے دوستی کرے گا تو شریروں سے علاحدہ بھی ہوگا، مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا، انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یک جا نہیں ہو سکتی، جیسا کہ قرآن نے کہا:

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَیۡنِ فِیۡ جَوۡفِہٖ — خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

(احزاب: ۳۳-۴)

ع سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیحؑ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

’’کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا، تم خدا اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے‘‘۔

(متی ۶-۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوس (۱) نے خدا اور آدمی، یعقوبؑ (۲) نے خدا اور دنیا، یوحنا (۳) نے خدا اور دنیا کے برے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے، اپنی ذات کے لئے نہیں، بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ ’’ایمان کی کون سی زنجیر زیادہ مضبوط ہے‘‘، عرض کی ’’خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے‘‘ فرمایا ’’یہ کہ باہمی میل جول خدا میں ہو، محبت بھی خدا ہی میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو خدا ہی میں ہو‘‘ مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ ’’کون سی نیکی خدا کو زیادہ

(۱) گلتیو ۱، کے نام: ۱-۱۰ (۲) یعقوب: ۴-۴ (۳) یوحنا: ۲-۱۵۔

پیاری ہے"، کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپ ﷺ نے فرمایا "تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے کہ خدا ہی کے لئے محبت اور خدا ہی کے لئے مخالفت ہو" (۱)۔

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں: خدا کے لئے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا نارضامندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض وغایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو اور اس کے سبب سے اس شخص سے علاحدگی و بیزاری ہو، جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں، قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ (حجرات:۴۹-۷)	خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ بنایا۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق وعاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق وفجور اور عصیان کو نفرت اور کراہت کا مورد قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نارضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے، یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے، فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (توبہ:۹-۱۱)	تو اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتاً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے، اور نارضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے، کیوں کہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت وکراہت کا وجود نہیں، نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ ہے، نہ چنڈال ہے، نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بد گہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین غیر یورپین کی تقسیم ہے، جو کچھ ہے وہ کفر وایمان اور شرک وتوحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابو جہل ابولہب ہوسکتا ہے اور ایک معمولی حبشی وعجمی مومن وموحد ہو کر بلال حبشی،

(۱) مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ ص ۴۲۶۔

صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمرؓ، وہی سفیانؓ، وہی عکرمہؓ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علم بردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے، بہ یک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران:۳-۱۰۳)	(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے، جس کی بنا کسی انسان کی گنہ گاری اور عصیان کاری پر ہے، توبہ وندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت وشفقت سے مبدل ہو جاتا ہے، مبشر عالم ﷺ نے ایسے گنہ گاروں کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. (زمر:۳۹-۵۳)	اے میرے وہ بندو! جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، خدا سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے، وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا التائب من الذنب کمن لاذنب له (۱) ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو''، یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گنہ گاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور ان کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سنائی، ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی، وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑ آئے تو صحابہؓ نے کہا خدا اس پر لعنت کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، آنحضرت ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا ''تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو، خدا کی قسم مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کو پیار کرتا ہے'' (۲)، اس واقعہ سے علما نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گناہ گار پر بددعا نہ کی جائے (۳)، ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے، جو بشری کمزوری سے زنا

---

(۱) ابن ماجہ کتاب الزہد باب ذکر التوبۃ ج۲ص۳۲۳ (۲) صحیح بخاری کتاب الحدود باب مایکرہ من لعن شارب الخمر ج۲ص۱۰۰۲ (۳) فتح الباری شرح حدیث مذکور کتاب الحدود باب مایکرہ من لعن شارب الخمر ج۱۲ص۶۸۔

کے مرتکب ہوئے، واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے، تاہم انہوں نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی اور سزا کی درخواست کی، آنحضرت ﷺ نے کئی دفعہ ان کی درخواست رد کی، لوگوں سے تحقیق کی کہ یہ پاگل تو نہیں، سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے، اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، وہ میدان میں کھڑے کئے گئے، اور ان پر لوگوں نے ہر طرف سے سنگ باری کی اور اسی حال میں انہوں نے جان دی، صحابہؓ میں بعض ایسے تھے، جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعز کو برا کہتے تھے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا "ماعز کے لئے خدا سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے" (۱)۔

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آکر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا، وہ اس کے بعد آئی، فرمایا بچہ کی پرورش کرلو، جب بچہ دودھ چھوڑ دے تب آنا، وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبک دوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احساسِ گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا، آپ ﷺ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالدؓ بن ولید کے منہ پر پڑیں انہوں نے عورت کو برا کہا، آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ "خالد چپ رہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا" (۲)۔

ترکِ ھویٰ: آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض وغایت پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لئے ہے تو وہ نیکی نہیں، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ھویٰ ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال واعمال واخلاق کو ھویٰ سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لئے وہ کام کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دین حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے یہ کہا کہ ان کا دین ومذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور ان کے سینوں کے اندر اغراض نفسانی اور خواہش وھوا کے بت چھپے ہیں، قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا:

(۱) و (۲) یہ دونوں واقعے صحیح مسلم کتاب الحدود باب من اعترف علی نفسہ ج ۲ ص ۶۷ میں ہیں۔

اَفَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (جاثیہ:۴۵-۲۳) اے پیغمبر کیا تونے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اسی لئے نفس کے تزکیہ وصفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لئے شریعت محمدی ﷺ نے ترکِ ھویٰ کا طریقہ پیش کیا، بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے، کیوں کہ اگر وہ ہر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض وغایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا، اسی لئے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں، بلکہ ہر بری خواہش، ہر باطل غرض، اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے، کیوں کہ اسی کی پیروی سے گمراہی وضلالت پیدا ہوتی ہے، وحیِ محمدی ﷺ نے فرمایا:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (قصص:۲۸-۵۰) اور اس سے زیادہ گم راہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔

پھر فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص:۳۸-۲۶) اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔

عدل وراستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے، وہ اسی ھویٰ کے زہرِ قاتل سے مرجاتی ہے، فرمایا:

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا (نساء:۴-۱۳۵) عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے، فرمایا:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى. فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى. (نازعات:۷۹-۴۰،۴۱) اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔

اخلاق اور محبتِ الٰہی: دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو، یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے، ان میں دیگر ضروریاتِ دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسنِ اخلاق ہے، عقائد کے

باب میں محبت الٰہی کے زیر عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے، مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو توراۃ اور انجیل میں بھی ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیوں کر مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے، مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعیِ خیر کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی زبان سے فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳-۳۱)	کہہ دو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت کرے گا۔

اس لئے آنحضرت ﷺ کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبتِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں، اس سے اسلامی اصولِ اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں، حسنِ خلق بھی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے، بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں:

وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ. (آل عمران:۳-۶۸)	اور خدا ایمان والوں کا دوست ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ. (بقرہ:۲-۱۹۵ و مائدہ:۵-۱۳)	خدا اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ. (بقرہ:۲-۲۲۲)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ. (آل عمران:۳-۱۵۹)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ. (مائدہ:۵-۴۲ و حجرات:۴۹-۹)	خدا انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ. (توبہ:۹-۴)	خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ. (آل عمران:۳-۱۴۶)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ. (توبہ:۹-۱۰۸)	اور خدا پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ (صف:۶۱-۴)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ان آیات پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں، جو محبتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

حسب ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبت الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں:

فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ. (آل عمران:۳-۳۲)	تو خدا کافروں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. (بقرہ:۲-۱۹۰ و مائدہ:۵-۸۷)	خدا حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا. (نساء:۴-۳۶)	خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو اترانے والا اور شیخی مارنے والا ہو۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيْمًا. (نساء:۴-۱۰۷)	خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار گنہ گار ہو۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ. (انفال:۸-۵۸)	خدا خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ. (حج:۲۲-۳۸)	خدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ. (قصص:۲۸-۷۶)	خدا اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ. (قصص:۲۸-۷۷)	خدا فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ. (انعام:۶-۱۴۱)	خدا فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ. (نحل:۱۶-۲۳)	خدا مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ. (شوریٰ:۴۲-۴۰)	خدا ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ. (بقرہ:۲-۲۷۶)	خدا ناشکر گنہ گاروں کو پیار نہیں کرتا۔

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانا، فخر وغرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیاں ہیں، جو انسان کو محبتِ الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبتِ الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیمِ اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت ﷺ کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لئے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا، اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی ان کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر، آراستہ و پیراستہ بنانا، اسی لئے آپ ﷺ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ:

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (بقرہ:۲-۱۲۹) وہ (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک وصاف کر کے نکھارتا ہے۔

اور اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ:

وانما بعثت معلما (۱) اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو، جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تن درست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کرسکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تن درست گوشت و پوست پیدا کرسکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیمِ اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہیں لیا، مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے، تو اس کو سزا دیتے تھے (۲)، قریش کی ایک بیوی چوری کے جرم

(۱) ابن ماجہ: باب فضل العلماء ج ۱ص ۲۱ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا ج ۲ص ۹۰۴۔

میں پکڑی گئیں، بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دیتی تھیں اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے احکام ٹال جاتے تھے (۱)۔

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی ﷺ میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا، صحابہؓ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے، آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا کہ تم سختی کے لئے نہیں بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں، یہ نجاست کے لئے موزوں نہیں، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لئے ہیں، پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہادو (۲)۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بہ حالت روزہ ایک غلطی ہوگئی، اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور ﷺ کے پاس لے چلو، انہوں نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا، دو مہینے لگا تار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا، فرمایا، تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو، عرض کی ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تم اور تمہارے گھر والے کھائیں، وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضور ﷺ نے کتنی نرمی کی (۳)۔

یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدودِ الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی، لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل ورذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ ﷺ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف ومحبت سے فرما دیتے تھے:

ع قاہری با دلبری پیغمبری است

(۱) صحیح بخاری کتاب الحدود باب اقامة الحدود ج ۲ ص ۱۰۰۳ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا ج ۲ ص ۹۰۴ و کتاب الوضو باب صب الماء علی البول فی المسجد ج ۱ ص ۳۵ و صحیح مسلم کتاب الطهارة باب وجوب غسل البول ج ۱ ص ۱۲۵ (۳) ابوداؤد کتاب الطلاق باب فی الظهار ص ۳۰۱۔

اخلاقی فضائل ورذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے، کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکم خداوندی بتا کر، کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ، کہیں اس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی اور کہا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ. (نحل:۱۶-۹۰)	بے شک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات، اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی سے منع کرتا ہے، تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو اور ان سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادر مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں، اس تعمیل میں بندوں کے چوں وچرا کی گنجائش نہیں۔

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے، مثلاً خدا کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے، جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ (بقرۃ:۲-۲۶۱) یہ نیکی ایک دانہ ہے۔

زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریا ونمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے، قرآن نے اس کو یوں ادا کیا كَمَثَلِ صَفْوَانٍ (بقرہ:۲-۲۶۴) اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہ گئی اور چٹان دھل کر صاف ہو گئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ ”جو ایسا کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں“ (نساء:۴-۱۰) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی ”کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے“ (حجرات:۴۹-۱۲) کسی کو کوئی چیز دے کر

واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت ﷺ نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے، ''جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے'' (۱)، اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی ہوسکتی ہے؟۔

قبیلہٗ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آ کر عدالتِ نبوی ﷺ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضور ﷺ نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگ سار کئے جانے کا حکم دیا، جب وہ سنگ سار ہو چکا تو آپ ﷺ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ ''اس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگ سار کیا گیا''، حضور ﷺ یہ سن کر خاموش رہے، تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی، آپ ﷺ نے پکارا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں، انہوں نے کہا ہم یہ ہیں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا تم اترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ، انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول ﷺ اس کو کون کھائے گا، فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھنونی بات ہے (۲)۔

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لئے اس زیادہ مؤثر طرز کوئی ہوسکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کردیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے، اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے، مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بہ وضاحت بیان کیا، ''مسلمانو! شراب، جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے''۔ (مائدہ: ۵-۹۰،۹۱) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین اور دنیا کے فرض سے غافل اور بے کار ہو جاتا ہے، نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے۔

---

(۱) کتاب الهبة باب لایحل لاحد ان یرجع فی هبته ج ۱ ص ۳۵۷'' ک، ص'' (۲) سنن ابی داؤد کتاب الحدود باب فی الرجم ص ۶۰۸۔

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے، جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے، مثلاً عفو ودرگزر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا۔ (نساء:۴-۱۴۹)	اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرنے والا قدرت والا۔

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، تخلقوا باخلاق اللہ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے، اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے (۱)

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا نہیں:

ان اللہ جمیل یحب الجمال (۲)	اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔

اس لئے بندوں کو بھی چاہئے کہ اپنے طور وطریق ولباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم واستقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب:۳۳-۲۱)	تمہارے لئے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ کے نمونہ سے دی گئی:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِىْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (ممتحنہ:۶۰-۴)	تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی ہے اور ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

---

(۱) تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ج ثالث ص ۳۸۵ (۲) صحیح مسلم کتاب الایمان باب تحریم الکبر و بیانہ ج ۱ ص ۴۹، ترمذی ابواب البر باب ماجاء فی الکبر ج ۲ ص ۲۰۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یوں ذہن نشین کرایا:

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوٓا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ — بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔

(بنی اسرائیل: ۱۷-۲۷)

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی، جاہل عربوں کے ذہن نشین کردی، جابرؓ بن سلیم ایک صحابی دربار نبوت ﷺ میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجالاتے ہیں، میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں، یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا اے اللہ کے رسول ﷺ آپ پر سلام (علیک السلام) آپ ﷺ چپ رہے پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو، میں نے کہا کہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا، ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور جس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اگا دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لق ودق بے نشان بنجر میں ہو، تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے تم دعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے، میں نے عرض کی، یارسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، ارشاد ہوا کسی کو برا نہ کہو، جابرؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام، یہاں تک کہ جانور کو بھی برا نہیں کہا، آپ ﷺ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سی چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو، یعنی اس کو کئے جاؤ اور تم کو چاہئے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمہارا چہرہ کھلتا رہے، یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے، کیوں کہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے (۱) اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا اور اگر تمہیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے تم کو اس کی عار دلائے تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا۔ (۲)

اس طریقۂ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے کہ آپ ﷺ نے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور اس

---

(۱) عرب امرا فخر وغرور کے لئے ایسا کرتے تھے جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا، دوسری قوموں میں شاہانہ غرور کی نشانی تھی۔ (۲) سنن ابی داؤد کتاب اللباس باب فی اسبال الازار ص ۵۶۵۔

سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی میں خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا اور حضور اقدس ﷺ سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی، ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو، پلاتا چلا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں، حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی، اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے نصیحت فرمائیے! ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر، اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا، آپ ﷺ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر (۱)، اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہوجاتی ہوں گی، اس لئے آپ ﷺ نے اس کے لئے یہ علاج تجویز فرمایا، جس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا، اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپ ﷺ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے؟ فرمایا خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا، پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے، فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو، پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کرسکوں؟ فرمایا تو کسی بے کس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کردو، پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے، فرمایا کہ شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کرسکتے ہو (۲)۔

کبھی آپ ﷺ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپ ﷺ ان کی اس توجہ کو مفید پا کر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہؓ سے آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی، ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز،

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب ج۲ ص۹۰۳ و ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب ج۲ ص۲۲ (۲) ادب المفرد بخاری ص۴۵ مصر۔

روزہ اورزکوۃ کی نیکیاں لے کرآئے گا،لیکن اس نے اس کوگالی دی ہوگی ،اس پر تہمت لگائی ہوگی،اس کا مال کھا گیا ہوگا،اس کا خون بہایا ہوگا،اس کو مارا ہوگا تواس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا،اگراس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اوراس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی، پھروہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا(۱)۔

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ ﷺ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو،لوگوں نے کہا جس کولوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں ،فرمایا نہیں ،یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جوغصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے(۲)۔

اس شخص کوجس کے بچے نہ جیتے ہوں،صبر کی تلقین کرنی تھی تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم کس کو کہتے ہو،صحابہؓ نے عرض کی جس کے بچہ نہ ہو،فرمایا وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی (۳)،(احادیث میں ہے کہ جو بچے کم سنی میں مرجائیں اوران کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے)اس طریقۂ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں، بلکہ اگراس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنخضرت ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور برا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے،(شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگوں کے نام لیں گے) آپ ﷺ نے دوسری بار یہی سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا،ایک شخص نے کہاں ہاں یارسول اللہ ﷺ فرمائیے ،ارشاد ہوا،تم میں سب سے اچھا وہ ہے،جس سے اچھائی کی امید کی جائے ،اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں اورتم میں سب سے برا وہ ہے،جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو(۴)۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کران پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں“،ابوہریرہؓ نے کہا میں اے اللہ کے رسول ﷺ،

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم ج۲ص۳۸۶(۲)ایضاًباب فضل من یملک نفسہ عند الغضب ج۲ص۳۹۶(۳)ایضاًج۲ص۳۹۶(۴)ترمذی اواخر کتاب الفتن ج۲ص۵۲ صحیح۔

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے میرا ہاتھ پکڑلیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں، گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے، اس پر راضی رہو، تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگوں کے لئے وہی چاہو، جو اپنے لئے چاہتے ہو، تو مسلمان بن جاؤ گے، اور زیادہ ہنسانہ کرو، کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے (۱)، (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)۔

ایک دفعہ فرمایا ''کون مجھ سے اپنے دو جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں'' (۲)، کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لئے اٹھے ہوں گے، ان فقروں کی بلاغت پر غور کرو، دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے، جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرم گاہیں ہیں، جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں، ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپ ﷺ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا میں اے اللہ کے رسول، فرمایا کسی سے کچھ نہ مانگا کرو، چنانچہ انہوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا (۳)۔

سب کو معلوم ہے کہ ارضِ حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے، حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ منیٰ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، تو دریافت فرمایا، لوگو! آج کون دن ہے؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں، عرض کی اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں، سب نے کہا جی ہاں، پھر پوچھا یہ کون مہینہ ہے، پھر سب چپ رہے، سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے، فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں، سب نے کہا جی ہاں، پھر فرمایا یہ کون سا مقام ہے، پھر سب خاموش رہے کہ آپ ﷺ کوئی اور نام بتائیں گے، فرمایا کہ کیا یہ بلد الحرام نہیں ہے، سب نے کہا جی ہاں، ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا، مسلمانوں کا خون،

---

(۱) جامع ترمذی ابواب الزھد ج۲ص۵۶ (۲) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب حفظ اللسان ج۲ص۹۵۹ (۳) مسند احمد ج۵ص۲۷۵۔

مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لئے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں (۱)۔

کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے، حضرت ابوذر غفاریؓ گویا فطرتاً تارک الدنیا تھے، بڑے ہی زاہد و عابد تھے، ان کے ذوقِ طبع کو دیکھ کر ان سے فرمایا، اے ابوذر! جہاں رہو خدا سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو (۲)۔

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے، آنحضرت ﷺ کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا ''تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے، اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی اونڈیل دینا بھی صدقہ ہے (۳)''۔

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت ﷺ نے اس طریقۂ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔

کبھی آپ ﷺ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی۔ (سورہ ممتحنہ: ۶۰-۱۲)

عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ''ہم ہر حالت میں رسول ﷺ کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل وانصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے'' (۴)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب المناسک الخطبۃ فی ایام منیٰ ج ۱ ص ۲۳۴ (۲) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی معاشرۃ الناس ج ۲ ص ۱۹ (۳) ترمذی ابواب البر والصلۃ فی صنائع المعروف ج ۲ ص ۱۶ (۴) مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۳۱۸۔

یہی عبادہؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی، ''ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے اور نافرمانی نہ کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے'' (۱)۔ اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سوال کرتے تھے، سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں، خود ہی جواب دے دیتے تھے، دریافت فرمایا کہ افترا کس کو کہتے ہیں، پھر خود ہی فرمایا ''وہ چغلی ہے، لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا'' (۲)، ایک بار ارشاد ہوا کہ ''تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں'' لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے، فرمایا ''تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو''، کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو، فرمایا اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے، ورنہ پھر وہ بہتان ہے'' (۳)، ایک موقع پر ارشاد ہوا، میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایا ہر کم زور، نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو، (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ خدا کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو خدا اس کی قسم پوری کر دے، پھر فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایا ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور (۴)۔

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے، حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کیا بات ہے، اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے، جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا ''خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، خدا کی

(۱) صحیح بخاری کتاب الدیات باب قولہ یا ایھا الذین آمنوا ج ۲ ص ۱۰۱۵ (۲) صحیح مسلم کتاب البر والصلة والآداب باب تحریم النمیمة ج ۲ ص ۳۹۵ (۳) ایضاً باب تحریم الغیبة ج ۲ ص ۳۹۵ (۴) صحیح مسلم باب جہنم۔

قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا''، صحابہؓ نے مشتاقانہ پوچھا، کون یا رسول اللہ ﷺ؟ فرمایا جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا(۱)، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ''دین داری اخلاص کا نام ہے، دین داری اخلاص کا نام ہے، دین داری اخلاص کا نام ہے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! کس کے ساتھ، فرمایا، اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ، اور عام مسلمانوں کے ساتھ(۲)''۔

---

(۱) مشکوۃ باب الشفقۃ علی الخلق ص۴۲۲ بحوالہ صحیحین (۲) ایضاً ص۴۲۳ بحوالہ صحیح مسلم۔

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصا کیا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، حقوق، فضائل ورذائل، اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے، یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے، اس کا نام فضائلِ اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے، مثلاً سچ بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے، اس کو آداب کہتے ہیں، مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور وطریق۔

ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

حقوق وفرائض

حقوق کے معنی: حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کردی جائے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ:۲-۲۹)	خدا نے تمہارے (کام کے) لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

اس لئے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے، یک گونہ لگاؤ ہے، اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی وحفاظت میں کوشش کی جائے، اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں خدا نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمہ داری کا نام حق ہے، جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے، ارشاد ہوا:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (ذاریات:۵۱-۱۹)	اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔
وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ. لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (معارج:۷۰-۲۴)	اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (بنی اسرائیل:۱۷-۲۶)	اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔
فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (روم:۳۰-۳۸)	تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے، ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے، یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، پھر مسافر، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے:

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا — اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو، اور فضول خرچی نہ کرو۔ (انعام:۶-۱۴۲)

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی، اور پھل پھول نکلے اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور اس میں ان کو بھی کچھ دے، جن کو یہ نعمت نہیں ملی اور اس نعمت کو بے موقع خرچ کر کے ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع ومحل کو نقصان پہنچانا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

ان لزوجک علیک حقا ولزورک علیک حقا(۱) — تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

ولاھلک علیک حقا(۲) — تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے، کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے (۳)، ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں، بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے، اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

فان لنفسک علیک حقا(۴) — بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔

فان لجسدک علیک حقا ولعینک علیک حقا(۵) — تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت: جب انسان کا تعلق کائنات ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب

---

(۱) بخاری کتاب الصوم باب حق الجسم فی الصوم ج۱ص۲۶۵ (۲) ایضاً باب حق الاھل فی الصوم (۳) ابوداؤد کتاب النکاح باب حق المرأۃ علی زوجھا ص۲۹۱ (۴) بخاری کتاب الصوم باب حق الاھل (۵) ایضاً باب حق الجسم۔

تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام وآسایش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس سے مناسب طور سے وہ کام لے۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بہ تدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں، لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بے جان اور جان دار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیحِ مقصد کے لئے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جان دار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں ان سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشوونما، پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے اور اس کے مناسب غذا، سیرابی اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ:۲-۲۹) زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لئے پیدا کیا۔

کے صریح نتیجے ہیں کہ جب انسان کے لئے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں، تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کے لئے وہ بنائی گئیں اور اس لئے تا کہ وہ وقت مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں، ان کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ ''ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جارہا تھا کہ دفعتاً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، میں تو کھیتی کے لئے پیدا لیا گیا ہوں'' (۱) اور اسی لئے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا ہے اور فرمایا گیا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے (۲)، اسی سبب سے پھل دار درخت کو بے سبب

(۱) صحیح بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ ج ۱ ص ۳۱۲ (۱) صحیح بخاری باب فضل الزرع والغرس و مسلم باب مذکور ج ۱ ص ۶۱۹۔

کا ٹنا ناپسندیدہ ہے(۱)، ایک اور تمثیلی حکایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لئے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی (۲) اور ایک اور عورت پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا، یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مرگئی (۳)، ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی (۴)۔

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لئے بھی کئے گئے ہیں تا کہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے، وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جان دار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے، جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب: مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ وانجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف ''محبت کرنا'' کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہئے، جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل وتکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لئے رکھتے ہو'' (۵)، اس سے معلوم ہوا کہ جسم وجان اور مال وملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم وجان اور مال وملکیت کے لئے چاہتا اور پسند کرتا ہے، وہی دوسروں کے لئے چاہنا اور پسند کرنا، توراۃ وانجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرِ عنوان ہے، لیکن اسلام میں یہ سر عنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے، جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری ونزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کردیا ہے، مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بے گانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان

(۱) فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکور جلد خامس ص ۷ مصر (۲) صحیح بخاری ابواب المظالم باب الآبار علی الطریق ج ۱ ص ۳۳۳ (۳) ایضاً کتاب الانبیاء ص ۴۹۵ (۴) صحیح بخاری کتاب الجهاد ج ۱ ص ۴۲۴ (۵) صحیحین کتاب الایمان۔

عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری ونزدیکی کی ترتیب بھی اسی طرح رکھی گئی ہے، مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس غیرو بےگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیزداری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے، جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے(۱)۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خطِ فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے، مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان کے اور پھر انسانوں میں اہل ملک، قوم، قبیلہ، اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں، بلکہ سرے سے رشتہ وقرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی، اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر کا درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پاسکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے برترانہ حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ دراوں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے، اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہو جاتی ہے، مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کرسکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے، پھر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلّہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہئے، یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے، ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے ان کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے، یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے، کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارکر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو، اگر ایسا وہ نہ کرسکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا، شریعتِ محمدی ﷺ نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے:

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ باب فی العصبیۃ ص ۶۹۸۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (نساء:۴-۳۶)	اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ، اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ۔
قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ. (بقرہ:۲-۲۱۵)	اے پیغمبر! ان سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو وہ اپنے ماں باپ، اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لئے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو، اللہ اس سے آگاہ ہے۔
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا. (بنی اسرائیل:۱۷-۲۶)	اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین کا اور مسافر کا اور فضول خرچی نہ کر۔

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے، مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے، تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے:

''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو'' (خروج ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

''تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے'' (احبار ۱۹-۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ:

''اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے مار ڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے، اس کا خون اسی پر ہے'' (احبار ۲۰-۹)

''اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے'' (خروج ۲۱-۱۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے، بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:

''کیوں کہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے، پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا، اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا'' (متی ۱۵-۴) (۱)

---

(۱) اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراۃ کے الفاظ کا بعینہ اعادہ ہے، مثلاً متی ۱۹-۱۹- مرقس ۷-۱۰ و ۱۰-۱۹- لوقا ۱۸-۲۰۔

نبوت محمدی ﷺ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے، اس نے تورات وانجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اوران سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی، بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

۱- اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کم زوری، بے چارگی اور حمل، وضعِ حمل اور تربیتِ اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی، اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اوراس کی فرماں برداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ (لقمان:۳۱-۱۴)

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی، اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا، اور دو برس تک دودھ پلایا۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (احقاف:۴۶-۱۵)

اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے میں۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، اس نے عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، تین دفعہ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ (۱)، ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرِ فہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے (۲)، ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں، دریافت کیا کیا خالہ ہے؟ گذارش کی ہے، فرمایا "تو اس کے ساتھ نیکی کر" (۳)، یہی اس کی توبہ بتائی،

(۱) صحیح بخاری ج۲ کتاب الادب باب من احق الناس بحسن الصحبۃ ص۸۸۳ (۲) ایضاً باب عقوق الوالدین من الکبائر ص۸۸۴ (۳) جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی بر الخالۃ ج۲ ص۱۲۔

ایک اور صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ ﷺ سے مشورہ چاہتا ہوں، فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ جواب اثبات میں دیا، فرمایا ''تو اسی سے چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے'' (۱)۔

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں مخلوقاتِ انسانی میں جنسِ لطیف ہی کی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے، انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں، وہ خالقِ اکبر کی علتِ فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں، لیکن باپ کی مادی علیت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں، مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا، پھر اس کے جننے کی ناقابل برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا، پھر اس نو پید امضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا، اور اس کی پرورش اور غور و پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی، ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لئے شریعتِ محمدی ﷺ نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے، وہ اس کی سزاوار ہے۔

۲- ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشو و نما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں، اس لئے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی ''عزت'' کرنے اور ان سے ''ڈرتے رہنے'' کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ ان کی خدمت، ان کی اطاعت، ان کی امداد، اور ان کی دل دہی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، ان ہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے، بلکہ ان ہی کی خوش نودی سے خدا کی خوش نودی ہے، قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ

(۱) ترغیب و ترہیب منذری ج ۲ ص ۱۲۴ مطبعہ عامرہ مصر ۱۳۲۴ھ بحوالہ ابن ماجہ و نسائی و حاکم۔

پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (بقرہ:۲-۸۳)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

یہ آیت پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ ''نیکی کرنے'' کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے، جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آ گئی ہے اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت، اور عزت کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔

اسی سورہ میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (بقرہ:۲-۲۱۵)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کے لئے۔

سورہ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (نساء:۴-۳۶)

اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمی وخیالی باتیں پیدا کر لی تھیں، اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں، خدا کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (انعام:۶-۱۵۲)

کہہ (اے پیغمبر) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا:

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْ ھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا . وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا. (بنی اسرائیل:۱۷-۲۳،۲۴)

اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف بھی نہ کہو اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی، اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں، بہ جز اس کے کہ اگر وہ اس شرک کی دعوت دیں تو ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے، ارشاد ہوا:

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حُسْنًا ط وَاِنْ جَاھَدٰکَ لِتُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (عنکبوت:۲۹-۸)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں، تو ان کا کہنا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف ان کی اس دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسنِ سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے، فرمایا:

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَھْنًا عَلٰی وَھْنٍ وَّفِصٰلُہٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ. وَاِنْ جَاھَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا وَصَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا (لقمان:۳۱-۱۴،۱۵)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا کہ وہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گذران کر۔

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی نیز شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بہ زور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانیں، مگر دوسری دنیاوی باتوں میں ان کا ادب، ان کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا، مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لا کر حسنِ خاتمہ پر مرے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ (ابراہیم:۱۴-۴۱) اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی:

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ (نوح:۷۱-۲۸) میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

اس لئے والدین کے حسنِ خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیا علیہم السلام کی پیروی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں، ان کی خدمت بجالاتے ہیں اور ان کے لئے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ إِنِّيْ تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ. أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ. (احقاف:۴۶-۱۵،۱۶)

اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اٹھایا، اور تکلیف کر کے جنی، اور تیس مہینوں تک اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا، یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا، اور چالیس برس کا ہوا، اس نے کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں، جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی کہ میں وہ کام کروں جس کو تو پسند کرے اور میری اولاد نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرماں برداروں میں ہوں، یہی وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول اور ان کے

برے کاموں سے درگذر کرتے ہیں، یہ جنت والوں میں

ہوں گے، یہ سچائی کا وہ عہد ہے، جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے، کبھی فرمایا ہے کہ "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے"، کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے"، کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! میرے حسنِ معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، گذارش کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، چوتھی بار فرمایا تیرا باپ اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے، ایک دفعہ حضور انور ﷺ مجلسِ قدس میں تشریف فرما تھے، جاں نثار حاضر تھے، فرمایا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، صحابہؓ نے پوچھا کون یا رسول اللہ ﷺ! ارشاد ہوا وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، اور پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت نہ حاصل کر لی(۱)، ایک اور مجلس میں صحابہؓ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا، عرض کی پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا، (جہاد)۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت موثر حکایت میں بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے کہ اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسا گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا، (اب ان کی بے کسی و بے چارگی اور اضطراب و بے قراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی) اس وقت انہوں نے پورے خضوع وخشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک نے کہا بار الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور ان ہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا، میں شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا، جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا،

(۱) مشکوۃ المصابیح بحوالہ احمد ونسائی وبیہقی کتاب الآداب باب البر والصلۃ ص ۴۱۸۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے، میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آ جاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لئے رات بھر سرہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے، خداوندا! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بہ خود جنبش ہوئی اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی دو مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے، مگر والدین کی خدمت گذاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے، اس لئے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے اس جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں، جس کو ان کی خدمت گذاری کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا، اسی لئے ابھی اوپر گذر چکا کہ آنحضرت ﷺ نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گذاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے خدمتِ اقدس میں آ کر شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی، دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں، عرض کی جی ہاں، ارشاد ہوا تو پھر ان ہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے، احادیث میں بھی اس کا وہی درجہ رکھا گیا ہے، صحابہؓ سے فرمایا کہ ''تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے''، ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت میں حاضر تھے دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں، انہوں نے عرض کی ضرور یا رسول اللہ ﷺ فرمایا، خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر برابر ہو گئے، اور فرمانے لگے، ''اور جھوٹی گواہی، اور ہاں جھوٹی گواہی'' (۱)۔

---

(۱) یہ تمام واقعات اور احوال عام کتب حدیث میں مذکور ہیں، خصوصیت کے ساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلہ، جامع ترمذی کتاب البر والصلہ، مشکوٰۃ باب مذکور۔

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے، وحیِ محمدی ﷺ نے بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ جو کوئی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے، وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بہ جائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ واستغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تا زندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہوگا، بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیوں کہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بہ جائے اتفاقی سمجھا جائے، تا آں کہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو(۱)۔

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے توراۃ نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے ان کو بالکل بے قدر کر دیا ہے، لکھا ہے:

> اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا، اور وہ ایک تن ہوں گے، (پیدائش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے ناآشنا تھے، تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے، ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرف داری اور حمایت کی اور اسی لئے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس ۱۰-۷و۸)، مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابل حل اختلاف ہو اور اس لئے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینی پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت

(۱) فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا، امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہریہ کے اصول کے مطابق قتلِ عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفورِ شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے، اس لئے اکثر فقہا نے اس کو قتلِ خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے، الا یہ کہ دلائل وقرائن باپ کے سوءِ قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے، جو ٹوٹ کر جڑ سکتا اور مٹ کر بدل سکتا ہے، لیکن والدین کا فطری تعلق نا قابل شکست اور نا قابل تغیر ہے، حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھی، جن سے وہ راضی تھے، مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو بہو پسند نہ تھیں، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت ﷺ نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کریں (۱)۔

(۱) مشکوۃ کتاب الآداب باب البر والصلۃ ص ۴۲۱ بروایت ترمذی وابوداؤد۔

اولاد کا حق

اصولی تعلیم: جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں، اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں، اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جو مذہب لے کر تشریف لائے، اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں، وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتادیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے، ان حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے، یہ متن ان سب پر محیط ہے، فرمایا:

لیس منا من لم یرحم صغیرنا، ولم یوقر کبیرنا(۱) — جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں، یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں بڑوں، افسروں، ماتحتوں، آقاؤں، نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے، حکیموں اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کرسکتا، وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں، اگر واقعاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونوں کا بارِ گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کرسکتا۔

---

(۱) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی رحمة الصبیان ج ۲ ص ۱۴۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کے نشو ونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہے، یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعۂ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اولاد کشی کا انسداد: عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگ دلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا، یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے، اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو مذہبی تھا، یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوش نودی کے لئے خود ذبح کر کے ان پر چڑھا دیتے تھے، منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچہ (۱) کی قربانی کریں گے، یہ قابل نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی، رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا (۲)، ہندوستان کے راج پوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم وعار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں، دیوتاؤں، دیبیوں کی خوشی اور نذرانے کے لئے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں، قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے (۳):

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ مَافَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَايَفْتَرُوْنَ. (انعام:۶-۱۳۸)

(جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں خدائے برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگا لیا ہے) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوب صورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں، تاکہ

---

(۱) سیرت ابن ہشام وطبقات ابن سعد وتاریخ طبری وغیرہ، کتب سیر میں عبد المطلب کا عبد اللہ کو قربانی دینے کا واقعہ نیز موطا امام مالک کتاب النذور باب مالا یجوز من النذور فی معصیۃ اللہ ص۱۷۹ (۲) لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ ج۲ ص۲۲۰ (۳) کشاف زمخشری تفسیر آیت ذیل۔

یہ دیوتا ان کو (ہمیشہ کے لئے) ہلاک کردیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کردیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ خدا پر وہ افترا کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو ایسا حکم دیا ہے، اس کو چھوڑ دے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام:۶-۱۴۱)

گھاٹے میں ہیں وہ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا۔

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا، اس لئے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبک دوش ہوتے تھے، نبوتِ محمدی ﷺ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا، بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جان دار کی روزی کا میرِ ساماں ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود:۱۱-۶)

اور زمین پر کوئی جان دار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے۔

اس لئے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا. (اسراء:۱۷-۳۱)

اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔

قتلِ اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں، بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں؟

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ

کہہ دے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، خدا کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے اپنے

وَاِيَّاهُمْ (انعام:۶-۱۵۲) بچوں کو نہ مارڈالو ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا شرک، پوچھا اس کے بعد، فرمایا والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی اس کے بعد، فرمایا یہ کہ "تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مارڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی" (۱)، یہ جواب حقیقت میں آیت بالا کی تفسیر ہے، ان ہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرتوِ فیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کردیا کہ رازق خدا ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے، اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لئے پاک ہوگئی۔

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کردینا تھا کہ لڑکیاں شرم وعار کا باعث سمجھی جاتی تھیں، جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور خدا کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ. (زخرف:۴۳-۱۷)

اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوش خبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے خدا پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم وعار کے مجسمہ کو پردۂ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتے، قرآن مجید نے اہل عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ. يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (نحل:۱۶-۵۸،۵۹)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوش خبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے (یعنی زندہ دفن کردے)۔

یوں تو اس رسمِ بد کا رواج تمام عرب میں تھا مگر اخبارِ عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التوحید وتفسیر سورہ بقرہ وسورہ فرقان وکتاب الادب و کتاب المحاربین وصحیح مسلم کتاب الایمان باب ای الذنب اعظم عند اللہ ج اص ۴۸۔

سب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا (۱)، بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود خاص سب سے آنحضرت ﷺ سے اقرار کیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے (۲)، یہ رسم جس شقاوت اور سنگ دلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرت ناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم ﷺ بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت (۳) ہے کہ ایک شخص نے آکر خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ "یارسول اللہ ﷺ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کو پوجتے تھے اور اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی، جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی، ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی، میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی، میں آگے بڑھتا چلا گیا، جب ایک کنویں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنویں میں ڈال دیا، وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی"، رحمتِ کونین ﷺ اس پر درد افسانہ کو سن کر آنسو ضبط نہ کر سکے، ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور ﷺ کو غمگین کر دیا، فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے" پھر ان صاحب سے فرمایا "ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر تو سناؤ" انہوں نے دوبارہ پھر بیان کیا آنحضرت ﷺ کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریشِ مبارک تر ہو گئی، پھر فرمایا "جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے، اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو"۔

قبیلۂ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انہوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں، فرمایا اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یارسول اللہ ﷺ میرے پاس اونٹ ہیں، فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو" (۴)۔

---

(۱) مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران ۱۲۹۰ھ ص ۳۶۸ و کتاب مجمع الامثال میدانی ج ا ص ۱۷۸ مطبعہ خیریہ مصر ۱۳۱۰ھ زیر مثل اضل من موؤدۃ (۲) ابن جریر و ابن کثیر و در منثور سیوطی، بحوالہ سنن بیہقی و مسند بزار و مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورہ تکویر (۳) سنن دارمی ص ا، یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں، لیکن اس لئے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آجائے۔ (۴) تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر، بحوالہ عبدالرزاق و بزار و در منثور سیوطی، بحوالہ مسند بزار و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورہ اذا الشمس کورت۔

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں، مائیں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لئے حوالہ کرتی تھیں، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے:

مـالقی المـوؤد من ظلم امـه　　　کـمـا لقیت ذھل جمیعا وعامر

زندہ دفن ہونے والے بچے نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک عورت نے آ کر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی، فرمایا "ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ دے دو" (۱)۔

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لئے صرف اسی قدر رہا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تو عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا، فرمایا ہاں، تم کو اس کا ثواب ملے گا کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے (۲)، اسی طرح زیدؓ بن عمرو بن نفیل جو بعثتِ نبوی ﷺ سے پہلے دین ابراہیمی کے پیرو تھے، وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوشِ شفقت میں لیتے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں وہ ان کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں چاہے ان کو میرے ہی پاس رہنے دو (۳)، یہ شخصی کوششیں تھیں، جو ملک میں بارآور نہ ہوئیں، لیکن بعثتِ محمدی ﷺ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لئے خزاں چھا گئی۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے، نبوت محمدی ﷺ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجاتِ اخروی کا ذریعہ بن گئیں، فرمایا "جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہو اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچا لے گی، وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی (۴)، نیز

(۱) موطا امام مالک باب النھی عن النذور فی معصیۃ اللہ (۲) تفسیر درمنثور بحوالہ طبرانی تفسیر سورہ اذا الشمس کورت (۳) صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل ج ۱ ص ۵۴۰ (۴) صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد ج ۲ ص ۸۸۷ و صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الاحسان الی البنات ج ۲ ص ۲۰۲۔

فرمایا ''جو دولڑکیوں کی بھی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہوجائیں، تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہوگا (۱)''، غور کیجئے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہدِ محمدی ﷺ میں آکر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لئے آپ ﷺ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی، صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں ان سے توبہ کی جو بیعت لی جائے، اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ:

وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ (ممتحنہ: ۶۰-۱۲) وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔

چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت ﷺ نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن جب عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لئے حاضر ہو رہے تھے تو آپ ﷺ نے عورتوں سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا، اور انہوں نے اقرار کیا (۲)، عید کے اجتماعِ عام میں عورتوں کے مجمع میں آپ ﷺ تشریف لائے اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد لیا (۳) کہ وہ قتلِ اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی، دوسرے موقعوں پر بھی جو خاتونیں دربارِ رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا (۴)، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پیش نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں ان میں ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعتِ عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ''وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے'' (۵)۔

حضرت عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بدکاری نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہوجائے گا اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخش دے

(۱) مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی الشفقۃ علی الخلق (۲) صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۶ ۷ تفسیر سورہ ممتحنہ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب کیفیتبیعۃ النساء ج ۲ ص ۱۲۶ (۳) صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۳۳ کتاب العیدین باب موعظۃ الامام النساء یوم العید (۴) ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ ج ۶ ص ۳۵۷ و سلمی بنت قیس ص ۳۷۹ (۵) تفسیر ابن کثیر ج ۹ ص ۳۴۳ برحاشیہ فتح البیان، بحوالہ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم ج ۲ ص ۶۲۴ علی شرط مسلم۔

چاہے عذاب دے(۱)"، صحابہؓ سے فرمایا کہ "خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اورلڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے"(۲)۔

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصری آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں، ان تمام سنگ دلیوں اوران تمام سفاکیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کرسکتی تھیں، قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں، غضبِ الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آکر کھڑی ہوجاتی ہیں، شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں:

وَاِذَا الْمَوْءُ دَةُ سُئِلَتْ. بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ. (تکویر:۸۱-۸،۹)

یادکرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی۔

کس درجہ بلیغ اور موثر طرز ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کردیتے تھے یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہدا حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے، حضرت علیؓ ہاتھوں میں اٹھالیتے اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے، حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہئے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اوراس کی خالہ میرے گھر میں ہے، حضرت زیدؓ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہئے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میرے ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دل خوش کن منظر کو دیکھتے ہیں پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کے گود میں دے دیتے ہیں کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے(۳)۔

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جس کی ہستی شرم وعار کا موجب تھی، جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان وباب وفود الانصار ومسلم کتاب الحدود ومسند احمد ج۵ص۳۱۴ ومستدرک حاکم ج۲ص۳۱۸ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب وکتاب فی الاستقراض وصحیح مسلم کتاب الاقضیۃ باب النھی عن کثرۃ المسائل ج۲ص۵۵ (۳) صحیح بخاری ج۲ص۶۱۰ کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء۔

کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا یا یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لئے دفعتاً چار چار گود خالی ہو جاتے ہیں اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (فرقان:۲۵-۷۴)

(جنت ان کو بھی ملے گی جو......) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا:

غدا الناس مذقام النبی الجواریا

پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔

رضاعت وحضانت: اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے، اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام میں ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علاحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (بقرہ:۲-۲۳۳)

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے لئے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس کی اہمیت کو قبول کیا اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے، فرمایا:

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (نساء:۴-۲۳)

اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشوونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ ہی پر ہے اور باپ نہ ہو تو دادا پر اور اس کے بعد درجہ بہ درجہ ورثا پر ہے۔

تعلیم وتربیت: ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی وروحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآنِ پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل وتشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم:۶۶-۶)

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنادیتی ہیں، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

خدا نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بارالٰہا! تو ان کو ظاہر وباطن کا حسن، صورت وسیرت کی خوبی اور دین ودنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا، فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (فرقان:۲۵-۷۴)

اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی اور سعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے، ایک سورہ میں خدا ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس

ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں اسی طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہیں:

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ. (احقاف:۴۶-۱۵)

اور (اے خداوند!) میرے لئے (میرے کاموں کو) میری اولاد میں صالح بنا، میں (اپنے گناہوں سے) تیری طرف باز آیا اور میں فرماں برداروں میں ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے، آنحضرت ﷺ نے اس باب میں وحیِ الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پا کر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا۔

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربار نبوی ﷺ میں آیا حضور ﷺ حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے تھے، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی، اس نے کہا کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا، حضور ﷺ نے اس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا" (۱) دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم وشفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں" (۲)، ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آنا چاہئے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کم سن بچیاں بھی تھیں، اس وقت کاشانۂ نبوی ﷺ میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، ام المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔

ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانوں کو اس سدِّ رمق سے محروم رکھے، اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا، آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضور ﷺ نے سن کر فرمایا، "جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور

---

(۱) و (۲) یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد ج ۲ ص ۸۸۷ میں ہیں، نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ ص ۷۰۸۔

وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لئے آڑ بن جائیں گی"(۱)، نیز یہ بھی ارشاد فرمایا"کہ جو شخص دولڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمرِ تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے(۲)، اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہوسکتا ہے؟، ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ"باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے"، ایک دفعہ یہ فرمایا کہ"کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے"(۳)۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے، ارشاد ہوا کہ"جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اسے جنت میں داخل فرمائے گا"(۴)، باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی ﷺ میں قائم نہیں، اسی لئے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانون کے برخلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا، اور چاہا کہ اس پر آنحضرت ﷺ کی شہادت ہو، انہوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے، عرض کی نہیں، فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا(۵)۔

اس سے اس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے یا اس کا کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کردی گئی اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔

☆

(۱) بخاری کتاب الادب ص ۸۸۷ (۲) صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب فضل الاحسان الی البنات ج ۲ ص ۴۰۲
(۳) ترمذی کتاب البر والصلة باب ماجاء فی ادب الولد ج ۲ ص ۱۶ (۴) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتامٰی ج ۲ ص ۷۰۰ (۵) ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولده فی النحل ج ۲ ص ۵۰۰۔

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن وشو کا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش ومسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت ومرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق وروح کی ترقیِ مدارج کے لئے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا، ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھو پن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمالِ روحانی کا ذریعہ تھا(۱)، اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہوسکتی ہے، اس سے بہ درجہا زیادہ تعلق ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناتا رکھے، اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہوسکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لئے اس کو کون سے فطری موقعے مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت وعصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے، مذہبی تجرد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد وعورت بلکہ آزاد وغلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر وبرکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ

اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے

---

(۱) انجیل قرنتیون (۱) باب ۷۔

مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. (نور:۲۴-۳۲) صالحوں کا نکاح کردیا کرو، اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کردے گا اور اللہ گنجایش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ ''اگر وہ غریب وتنگ دست ہوں گے تو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کو غنی بنادے گا'' یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر وبرکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا، اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے، ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بہ جائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے، اس فلسفہ کا راز اہل دولت نہیں، غریب ہی سمجھ سکتے ہیں، خصوصاً مزدور اور کاشت کار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لئے جو بےکاری سے غریب ہے بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے، خصوصاً اس لئے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کردے گی جس کے لئے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہوسکتا، آخر میں فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے، اس کی گنجایش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے، اس لئے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں۔

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھاسکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے، فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ	اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف
الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ	مومن عورتوں سے نکاح کرسکے تو تمہاری ان مومن
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ	باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ
بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (نساء:۴-۲۵)	میں ہوں اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے، تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف وآزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرلو، اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں، ایک یہ کہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہوسکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے

سے کچھ نہیں ہوتا، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور خدا کے نزدیک قبول ہے، دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ نومسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم رتبہ کیسے ہوں گی، تو فرمایا، یہ تفریق بھی غلط ہے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔

یہ اہتمامِ بیان اس لئے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (۱)

میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، چنانچہ زن وشو کے باہمی اخلاص ومحبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے، فرمایا:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (روم:۳۰-۲۱)

اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تا کہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا، بے شک اس میں سوچنے والوں کے لئے کتنی نشانیاں ہیں۔

قرآن پاک نے ایک لفظ ''سکون'' سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے، وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن، سکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لئے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوش گواری ہونی چاہئے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لئے خدا نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثارِ قدرت میں شمار کیا ہے، پورے ہوں، یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر ومحبت اور سکون اور چین اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے۔

(۱) صحیح بخاری ومسلم کتاب النکاح باب الترغیب فی النکاح ج۱ ص۵۳۴۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے جو زن وشو کے باہمی میل جول اور مہر ومحبت میں فرق ڈالیں، فرمایا:

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ......مَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (بقرہ:۲-۱۰۲)	تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں.......اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے، اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرماں برداری اور شوہر بیوی کی دل جوئی کرے، زن وشو باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لئے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں فرمایا:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُونَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (نساء:۴-۳۴)	مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لئے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں تو نیک بیبیاں فرماں بردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہ بانی کرتی ہیں کہ خدا نے ان کی حفاظت کی ہے۔

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بیبیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت وآبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو محفوظ کر دیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلافِ فطرت ہے۔

مرد وعورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ:۲-۱۸۷)	عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں، تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمہارے لئے، تم ان کی زینت ہو، وہ تمہاری، تم ان کی خوب صورتی ہو وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو وہ تمہاری، یہی نکاح کے اغراض ہیں، اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوق زوجین کو ادا کرنا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا:

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا (نساء:۴-۱)	اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس خدا کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو، اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے، ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے، جس سے کروڑوں مرد وعورت پیدا ہوئے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہئے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالقِ حقیقی کا اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہوسکتا، اس لئے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کے بہ دولت وجود میں آیا ہے اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر ومحبت اور الفت ومودت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد وعورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے، مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (مائدہ:۵-۵) ''پاک دامنی کے لئے نہ شہوت رانی کے لئے''، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا، ''اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو وہ نکاح کر لے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرم گاہیں محفوظ رہیں گی اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے، (ابن ماجہ: نکاح ص ۳۲۶)۔

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یک جہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو، باہم صلح کے لئے آمادہ رہنا چاہئے اور اصلاحِ حال کے لئے دونوں کو برابر کوشش کرنا چاہئے، اسی لئے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاحِ حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے، فرمایا: اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (بقرہ:۲-۲۲۸) اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں، وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا (نساء:۴-۱۲۹) اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو، کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدوں کو قائم کرنا کہا گیا ہے:

اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (بقرہ:۲-۲۳۰) یہ کہ میاں بی بی دونوں اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں۔

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھالیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انہیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں، مجبور ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ. (بقرہ:۲-۲۲۴)

اور خدا کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ، کہ سلوک نہ کرو، اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو، اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علاحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن وشو کے معاملہ سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بِرّ) پرہیز گاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ (نساء:۴-۳۴)

تو نیک بیویاں شوہروں کی فرماں بردار ہوتی ہیں، اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر (کے مال و دولت اور عزت و آبرو) کی حفاظت کرتی ہیں۔

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرماں بردار رہیں، ان کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت ان کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں اور ان کی عزت و آبرو کی جو خود ان کی اپنی عزت و آبرو ہے شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض،

اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت وعفت ہیں، حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کردے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے"، (ابن ماجہ: نکاح باب افضل النساء ص ۳۲۸)۔

زن وشو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی:

لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں، تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے، لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں، اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہ میں علاحدہ کردو اور ان کو ہلکی مار مارو تو اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، بے شک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے، تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں، جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں جن کا آنا تم کو پسند نہیں اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔ (۱)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے، فرمایا: جب خود کھائے تو اس کو کھلائے، جب خود پہنے تو اس کو پہنائے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لئے اس کو علاحدہ کرے، (ابن ماجہ: ایضاً) دوسری طرف آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں، یہاں تک فرمایا کہ "اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے" (۲)، آپ ﷺ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لئے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

خیرکم خیرکم لاھلہٖ (ترمذی ودارمی وابن ماجہ ابواب النکاح باب حسن معاشرۃ النساء ص ۱۴۳)	تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہے۔

(۱) ابن ماجہ ابواب النکاح باب حق المرأۃ علی الزوج ص ۳۲۷ (۲) ابن ماجہ ابواب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ ص ۳۲۷۔

خیارکم خیارکم لنسائهم (۱) — تم میں سب سے بہتر وہ ہیں، جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہیں۔

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کرسکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کرسکتا ہے، کیوں کہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہئے۔

ایک صحابی بڑے عابد وزاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا:

ولزوجک علیک حقا (۲) — اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدرومنزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی معمولی قصوروں پر ماری پیٹی جاسکتی تھیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار وقطار میں نہیں سمجھتے تھے، اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کئے (۳)۔

اسلام نے ان کی قدرومنزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بہ دوش کھڑا کردیا اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی، ارشاد ہوا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ:۲-۲۲۸) — اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے، یہ اس لئے ہے تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں، یہ

(۱) ترمذی ابواب الرضاع باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجها ج۱ ص۱۳۸ (۲) بخاری کتاب النکاح باب لزوجک علیک حق ج۲ ص۷۸۳ (۳) صحیح بخاری کتاب النکاح باب موعظة الرجل لحال زوجها ج۲ ص۷۸۱ وتفسیر سورہ تحریم۔

نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دور کرنے کے سلسلہ میں ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے، تا کہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لئے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں، قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتادی ہیں، فرمایا:

الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (نساء:۴-۳۴)	مرد عورتوں کے نگراں ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور اس لئے کہ انہوں نے اپنا مال خرچ کیا۔

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم وطاقت اور عقل وفراست وغیرہ میں جسمانی وذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بہ دم اس کی تائید میں ہیں، اسی لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرتاً ملنا چاہئے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دینِ مہر، نان ونفقہ اور پرورشِ اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تا کہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوش گواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدمِ تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں، آپ ﷺ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ ''عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے'' (۱)، آپ ﷺ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا، فرمایا ''اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی'' (۲)، یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے:

(۱) صحیح بخاری ومسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء ج ا ص ۵۷۰ (۲) صحیح مسلم حوالہ مذکور۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا. (نساء:۴-۱۹)

اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گذران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہو۔

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات، اور یک جہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لئے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علاحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے (۱)، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لئے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بہ قدر ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہندہ آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں آکر عرض پرداز ہوئی کہ یا رسول اللہ ﷺ ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں، لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں، فرمایا "تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو، جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو" (۲)۔

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا "تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی،...... مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے، اس سے اس کی پوچھ

(۱) اس اختیار کی تشریح میں فقہا مختلف ہیں، تفصیلات کے لئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہئے نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی ج ۶ ص ۲۶۳ مصر (۲) صحیح بخاری کتاب النفقات باب اذالم ینفق الرجل ص ۸۰۸۔

ہوگی"، (بخاری نکاح ج۲ص ۷۷۹ باب قُوْآ اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے: قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِیْ الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا (نساء:۴-۳۴)	اور جن بیویوں کے "نشوز" کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ، اور خواب گاہوں میں ان سے علاحدگی برتو اور ان کو مارو تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔

لغت میں "نشوز" کے معنی "اٹھ جانے" کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

ومعنی ذلک اذار أیتم منھن ما تخافون ان ینتزن علیکم من نظر الی مالا ینبغی لھن ان ینظرن الیہ ویدخلن ویخرجن واستربتم (۱) بامرھن (تفسیر طبری:۵-۳۸)	اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے "نشوز" کا ڈر ہو، یعنی ادھر دیکھنا جدھر ان کو نہیں دیکھنا چاہئے اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔
عن محمد بن کعب القرظی اذارأی الرجل تقصیر ھا فی حقہ فی مدخلھا ومخرجھا قال یقول لھا بلسانہ قدرأیتک منک کذا وکذا فانتھی (ایضا)	محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی، یہ دیکھی تو اب باز آجا۔

فقہ کی کتابوں میں ہے:

الناشزۃ ھی الخارجۃ عن منزل زوجھا المانعۃ نفسھا منہ (عالم گیری نفقات ج۱ص ۵۴۵ مطبعہ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ)	نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے۔

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں۔

کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے

(۱) اصل متن تفسیر میں واستبریتم غالباً غلط چھپا ہے۔

شوہر پر بلندی چاہے، اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رخی کرے اور اس سے بغض رکھے، (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۶۴۲ جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیت مذکور پوری یہ ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ
بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ
فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ
اللّٰهُ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ
اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا

(نساء:۴-۳۴)

مرد عورتوں کے نگراں ہیں، (ایک) اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، اور (دوسرے) اس لئے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں تو نیک بیویاں فرماں بردار ہوتی ہیں اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزت و(۱) آبرو کی) حفاظت کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو خواب گاہوں میں علاحدہ کردو اور ان کو مارو تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرماں بردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھر بار اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمہیں نشوز کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو یا اس سے بات کرنا چھوڑ دو، اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو، اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لئے حیلہ اور بہانا مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر میں بتا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر یہ بھی کہا جا چکا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرماں بردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھر بار، مال ودولت اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں

(۱) اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔

یعنی شوہر کی فرماں برداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھر بار اور عزت و آبرو کی حفاظت جو عورت ان دونوں کو یا ان دنوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

"شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت" کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا، سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے' اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت و عصمت ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت ﷺ کے جو فقرے ہیں ان میں نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے، صحیح مسلم میں ہے:

فاتقوا اللہ فی النساء فانکم اخذتموھن بامانۃ اللہ ولکم علیھن ان لا یوطین فرشکم احدًا تکرھونہٗ فان فعلن ذٰلک فاضربوھن ضربًا غیر مبرح (مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی ﷺ ج ا ص ۳۶۹)

عورتوں کے بارہ میں خدا سے ڈرو کہ وہ تمہارے بس میں امانتِ الٰہی ہیں، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے نہ روندوائیں، جس کو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں:

استوصوا بالنساء خیرا فانھن عندکم عوان لیس تملکون منھن شیئا غیر ذٰلک الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ فان فعلن فاھجروھن فی المضاجع واضربوھن ضربا غیر مبرح فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلاً (کتاب النکاح ص ۱۳۴)

عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں، تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں، تو اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہوں میں علاحدہ کردو، اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو ان پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو اور "کھلی بے حیائی" سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں، لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال

چلن (۱) سب کو فاحشۃ مبینۃ کی تفسیر میں داخل کیا ہے، (تفسیر سورہ نساء رکوع ۲)۔

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرع کی تصریح یہ ہے کہ ''ضرب غیر مبرح'' یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے، (۲)، جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آسکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حکم دیا کہ ''خدا کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو''، تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہوگئیں، تو آپ ﷺ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیت نبوی ﷺ کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا ''آل محمد ﷺ کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں، جو اپنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں'' (۳)۔

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ ﷺ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا (۴)'' یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا، ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ ﷺ میری بیوی بدزبان ہے، فرمایا طلاق دے دو، عرض کی اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا ''تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی، لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو'' (۵)، ایک دوسرے موقع پر فرمایا ''کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو'' (۶)۔

☆

---

(۱) یہ پیش نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لئے ہے ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگ ساری یا تازیانہ ہے، جس کا اجرا قاضی کا فرض ہے (۲) تفسیر طبری ج ۵ ص ۴۱ مصر (۳) مشکوۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء ص ۲۸۲ بحوالہ ابوداؤد و ابن ماجہ و دارمی (۴) صحیح مسلم باب المطلقۃ ثلثا ج ۱ ص ۵۸۳ (۵) مشکوۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء ص ۲۸۲ بحوالہ ابوداؤد (۶) ایضاً بحوالہ صحیح بخاری و مسلم ص ۲۸۰۔

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن وشو کے بعد درجہ بہ درجہ دوسرے اہلِ قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام ''صلۂ رحم'' ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ وحیِ محمدی ﷺ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (روم: ۳۰-۳۸) تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کر۔

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ (اسرائیل ۱۷-۲۶) اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر۔

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال ودولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى (بقرہ: ۲-۱۷۷) (اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے ......) اور مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (بقرہ: ۲-۲۱۵) فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے۔

ماں باپ کے بعد درجہ بہ درجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک خدائے تعالیٰ کے ان خاص احکام میں ہے، جن کا انسان سے عہد لیا گیا:

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى (بقرہ: ۲-۸۳) (اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا اور ماں باپ اور رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرنا۔

سورۂ نحل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا:

إِنَّ اللّٰہَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (نحل:۱۶-۹۰)
بے شک اللہ انصاف اور حسن سلوک اور قرابت دار کو دینے کا حکم کرتا ہے۔

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا:

قُلْ مَآ أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ (بقرہ:۲-۲۱۵)
کہہ دے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں کے لئے۔

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہلِ دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُّؤْتُوْٓا أُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰكِيْنَ (نور:۲۴-۲۲)
اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشایش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے بعد تیسری چیز اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی
اور اللہ کی عبادت کرو، اور کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔

(نساء:۴-۳۶)

حقِ قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعیِ اسلام علیہ السلام اپنی ان تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان وکرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف ومحبت سے پیش آؤ، فرمایا:

قُلْ لَّآ أَسْـئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (شوریٰ:۴۲-۲۳)
کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر بہ جز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل صلۂ رحم (رحم ملانا) ہے اور قرابت کے حق کو نہ ادا کرنے کو قطعِ رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں، کہ رحمِ مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے، کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت واعانت کی اصلی گرہ ہے، یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہم سائگی، کہیں

ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لئے جانبین پر حقوق کی نگہ داشت اور فرائضِ محبت کی ادائیگی واجب ہے، لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن، رحم مادر ہے، یہ ہم رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لئے اس کے حقوق کی نگہ داشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وحیِ محمدی ﷺ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور ان کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے:

وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ. الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ (بقرہ:۲-۲۷،۲۸)	اس سے وہ ان ہی کو گم راہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے، جو خدا کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا، اس کو کاٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے، اس لئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ "جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا" (۱) اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت ﷺ نے یوں ادا فرمایا کہ "رحم انسانی عرشِ الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے "جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے" (۲) ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے حسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا، ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحمِ انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل میں حقو ہے) تھام لیا، خدا نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا، کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں، جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں" (۳)، یعنی رحمِ مادر اور اس رحمٰن کے رحم و کرم کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہل قرابت کی ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب من وصل وصله الله ج ۲ص ۸۸۵ (۲) صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلة ج ۲ص ۳۸۰ (۳) ایضاً۔

رحم اور رحمٰن کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے، سورۂ نساء میں فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ (نساء:۴-۱)

اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتوں کا خیال رکھو۔

اس آیتِ پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے، فرمایا خدا کی بندگی کرو، کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق (صلۂ رحم) ادا کرو(۱)۔

جبیر بن مطعمؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا(۲) (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہولے گا یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)۔

ابوہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلۂ رحمی کرے'' (۳)، اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال ودولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے، کیوں کہ صلۂ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے، دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے، پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جاسکتی ہے، انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لئے اضمحلال، تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ، صلۂ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں، ان کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح اور طمانیتِ خاطر رہتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم ج۲ص۸۸۵ (۲) ایضاً باب اثم القاطع (۳) ایضاً باب من بسط لہ فی الرزق لصلۃ الرحم ج۲ص۸۸۵۔

اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے، ''صلۂ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے'' (۱)۔

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلۂ رحم کا جواب صلۂ رحم سے دے، بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرتا ہے، اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے (۲) یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں ان کا حق ادا کیا جائے۔

---

(۱) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی تعلم النسب ج۲ص۱۹ (۲) بخاری کتاب الادب باب لیس الواصل بالمکافی ج۲ص۸۸۶۔

ہم سایہ کے حقوق

ہم سایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں، انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراکِ عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تن درست ہو اس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہم درد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے، ہر انسان بہ ظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علاحدہ اور بہ جائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لئے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے، کہ وہی وقت پر اوروں سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لئے ان کے باہمی تعلقات خوش گوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ برائیوں کا سدِ باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بہ جائے بہشت کا نمونہ ہو اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہم سائگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں، عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہم سائگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لئے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا اور اس لئے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا، اسلام نے آکر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔

وحیِ محمدی ﷺ نے ہم سایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہم سایہ کو جگہ دی ہے، جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہم سایہ نہیں کہتے، مگر وہ ہم سایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہم سائگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے، ان سب قسموں کے ہم سایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے جس کو ہم سایہ ہونے کے علاوہ قرابت یا ہم مذہبی کا یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو، قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہے:

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (نساء:۴-۳۶)

اور (خدا نے) ہم سایہ قریب اور ہم سایہ بے گانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)۔

اس ''قریب'' اور ''بے گانہ'' کے معنوں میں اہلِ تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ ''قریب'' کے معنی رشتہ دار و عزیز اور ''بے گانہ'' کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں، دوسرے کی رائے ہے کہ ''نزدیک'' کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور ''دور'' سے مطلب دوسرے مذہب والے ہیں، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ (۱) لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیمِ محمدی ﷺ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہم سایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہم سائگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو، یا ہم مذہبی ہو، یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو، بہرحال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکمِ الٰہی کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا، ایک دن صحابہؓ کے مجمع میں آپ ﷺ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دل نشیں انداز سے فرمایا ''خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا'' جاں نثاروں نے پوچھا ''کون یا رسول اللہ ﷺ!'' فرمایا ''وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں'' (۲) ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا ''جو خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے'' (۳)، ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص خدا اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے'' (۴)۔

---

(۱) ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم من لایامن جارہ بوائقہ ج۲ص۸۸۹ (۳) صحیح بخاری کتاب الادب صفحہ مذکور (۴) ایضاً۔

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا، ارشاد فرمایا ''خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہے'' (۱)، ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ ''جبرئیلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو وراثت کا حق نہ دلادیں'' (۲)، حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہم سایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے، آنحضرت ﷺ خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے، اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا ''یا رسول اللہ ﷺ! میرے دو پڑوسی ہیں، تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں''، فرمایا ''جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو'' (۳)۔

اس ہدیہ اور تحفہ کے لئے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لئے کافی ہیں، کچھ نہ ہوسکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو، اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ ''اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہم سایوں کی خبر گیری کرتے رہو'' (۴)۔

ان تحفوں کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے، اس لئے آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کی کھر ہی کیوں نہ ہو'' (۵)، یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لئے ہے، یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اس کی حقارت کرے۔

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس

---

(۱) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی حق الجوار ج ۲ ص ۱۶ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب الوصاۃ بالجار ج ۲ ص ۸۸۹ (۳) ایضاً باب حق الجوار فی قرب الابواب ص ۸۹۰ (۴) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب الوصیۃ بالجار ج ۲ ص ۴۰۱ (۵) صحیح بخاری کتاب الادب باب لاتحقرن جارۃ لجارتہا ص ۸۸۹۔

کے پہلو میں بھوکا رہے" (۱)۔

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہئے تھی تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بہ درجہا زیادہ ہے، بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کرسکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ پڑوس کے مکان میں چوری کرنا کتنا برا ہے، بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے، مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کرکے باہر جاتے ہیں، اخلاقی خیانت کس قدر شرم ناک ہے، اسی لئے توراۃ میں یہ حکم تھا:

"تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ نہ کر" (خروج: ۲۰-۱۷)

"تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے" (احبار: ۱۹-۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبانِ حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی، جن میں توراۃ کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے، بلکہ اس کو دس گنا زیادہ برا کرکے دکھایا، ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"زنا حرام ہے، خدا و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام ہے، خدا و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرالے" (۲)۔

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں، مگر زبان کی تیز تھیں، زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں لوگوں نے ان کا حال آپ ﷺ سے عرض کیا تو فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں، ان کو دوزخ کی سزا ملے گی، پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتی تھیں اور معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں، فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی" (۳)۔

---

(۱) مشکوۃ از بیہقی باب الشفقة والرحمة على الخلق ص۴۲۴ و ادب المفرد امام بخاری باب لایشبع دون جاره ص۲۵ (۲) ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار ص۲۴ (۳) ادب المفرد امام بخاری باب لایوذی جاره ص۲۶۔

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:

''تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو، (مرقس: ۱۲-۳۰)

آنحضرت ﷺ نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے:

''تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لئے وہی پیار نہ رکھے جو خود اپنی جان کے لئے پیار رکھتا ہے''(۱)۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا:

''جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو یا یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، تو اس کو چاہئے کہ..........وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے''(۲)۔

اسی لئے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے وہ مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے جو پڑوسی ہوں گے(۳)، انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا، فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو''(۴)۔

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو، مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یارسول اللہ ﷺ میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا جاؤ صبر کرو، اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہی عرض کی، فرمایا جاکر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو، (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انہوں نے حقیقتِ حال بتائی سب نے ان کے پڑوسی کو برا بھلا کہا، یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۳۷ (۲) مشکوۃ از بیہقی ص ۴۲۴ (۳) احمد بن حنبل مسند عقبہ بن عامر ج ۴ ص ۱۵۱

(۴) سنن ابن ماجہ کتاب الزھد باب الثناء الحسن ص ۳۲۱۔

ہوا کہ وہ ان کو منا کر پھر گھر میں واپس لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ نہ ستائے گا(۱)۔

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گذار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جارہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیر المومنین، گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی (۲):

يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (احقاف:۴۶-۲۰)	جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے، (ان سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے جاچکے، اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے، جس کے مواخذہ کا ان کو ڈر لگتا ہے۔

ہم سایوں میں دوست و دشمن اور مسلم وغیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہم سایہ کو بھی بھیجا، کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریل ہم سایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حق دار بنادیں گے(۳)۔

---

(۱) ادب المفرد بخاری باب شکایۃ الجار ص ۲۸ و ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار ج ۲ ص ۱۰۷ (۲) موطا امام مالک باب ماجاء فی اکل اللحم ص ۳۷۳ (۳) ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار ص ۱۰۷۔

یتیموں کے حقوق

وہ کم سن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوشِ محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال واسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم وتربیت کی فکر رکھے، عقل وشعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔

عربوں میں روزانہ کے قتل وغارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی، مگر جیسا کہ چاہیے ان کے غور وپرداخت کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے، کیوں کہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے (۱)، اور نہ سنگ دل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم وشفقت کا جذبہ تھا، قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے:

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۔ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۔ (ماعون:۱۰۷-۲)

کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں:

کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ۔ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۔ وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا ۔ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۔ (الفجر:۸۹-۱۷تا۲۰)

نہیں یہ بات نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال ودولت پر جی بھر کر ریجھتے ہو۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم وشفقت اور ان کی امداد وپرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے، توراۃ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ

(۱) تفسیر ابن جریر طبری سورہ نساء ج ۴ ص ۱۷۰۔

یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں، (استثنا:۱۴-۲۹ و ۲۶-۱۲) انجیل نے ان بے چاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے، اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دینِ کامل کی شریعت لے کر دنیا میں آیا وحیِ الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا:

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی. (الضحیٰ:۹۳-۶) کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا تو اس نے پناہ دی۔

...فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ. (الضحیٰ:۹۳-۹) ....تو یتیم کو نہ دبا۔

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے، یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بے کس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں، دولت مندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھاٹی کو تم کیوں کر پار کر سکتے ہو؟ ظلم و ستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے:

اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ. یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ. یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھلانا۔

(بلد:۹۰-۱۴،۱۵)

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو:

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا (دھر:۷۶-۸) اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی، سورہ نساء میں اس بے کس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، ان کو وراثت کا حق دلایا گیا اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے، ان سے کہا گیا:

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا. (نساء:۴-۲)

اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو، اور ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ کرو اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھا جاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔

دولت مند یتیم لڑکیوں کو ان کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے اور بے والی و وارث جان کر ان کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (نساء:۴-۳)

اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کو چھوڑ اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کرلو۔

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہئے اور نہ جب تک پورا شعور آئے وہ ان کے سپرد کیا جائے، بلکہ ان کے سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد ان کی عقل کو دیکھ بھال کر ان کی یہ امانت ان کو واپس کی جائے، فرمایا:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَکُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاکْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا. وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (نساء:۴-۵،۶)

اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو خدا نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہو اور یتیموں کو جانچتے رہو، جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو۔

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے کہ ”تم اپنا مال ان کو نہ دو“ اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سنِ رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کردینے کا حکم ہے وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی ہے ”تم ان کا مال ان کو واپس کردو“، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے، تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہئے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے، جس پر تمہارا کوئی حق نہیں۔

متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں، اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی:

وَلَا تَاْکُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّکْبَرُوْا (نساء:۴-۶)

اور اڑا کر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں۔

صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو ان کے لئے ان یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا اور اگر تنگ دست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ (نساء:۴-۶)

اور جو (متولی) بے نیاز ہے اس کو چاہئے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی:

وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ (نساء:۴-۱۲۷)

اور یہ کہ یتیموں کے لئے انصاف پر قائم رہو۔

سورہ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی، اور جانوروں کی حلت وحرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی واخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی ان میں ایک یہ ہے کہ:

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (انعام:۶-۱۵۳)

اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔

سورہ اسرا کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحبِ جائداد یتیموں کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہئے، اور دیانت داری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے (سورہ اسراء:۱۷-۳۴)۔

یہ تو صاحبِ جائداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے، جو یتیم غریب ومفلس ہوں ان کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نساء، انفال اور حشر میں بار بار ان کی پرورش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی ، وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ خیرات وصدقات کے بہترین مصرف قرار دئے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی ووارث امت کے سرپرست ﷺ نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بے والی ووارث یتیموں کے کفیل ہوں، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا ''میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے(۱)''، یہ بھی فرمایا

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل من یعول یتیما ج۲ص۸۸۸ وصحیح مسلم کتاب الزھد باب فضل الاحسان الی الیتیم ج۲ص۵۳۳۔

کہ ’’جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطے کہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشایش کے لائق نہ ہو(۱)‘‘، نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ ’’مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جاتی ہے، اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو‘‘ (۲)۔

آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بے کس و ناتواں یتیموں کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا، ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لئے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کے لئے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا(۳)، بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشۂ رسول فاطمہ بتولؓ اپنے دعویٰ کو اٹھا لیتی ہیں (۴)، حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے خاندان (۵) اور انصار (۶) وغیرہ (۷) کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل و جان سے پالتی ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لئے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے (۸)۔

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانت داری برتنے لگے بلکہ ان کی جائدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا، مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا اور آپ ﷺ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ کو رحم آیا اور اس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو خدا تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا، وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا، ابوالدحداحؓ صحابی حاضر تھے، انہوں نے اس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو، اس نے آمادگی ظاہر کی، انہوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا (۹)۔

---

(۱) ترغیب و ترہیب منذری ج ۲ ص ۱۳۲، ۱۳۳ بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح) (۲) ایضاً بحوالہ ابن ماجہ و ادب المفرد باب خیر بیت الخ ص ۳۰ (۳) صحیح بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء ج ۲ ص ۶۱۰ (۴) ابوداؤد کتاب الخراج والفیء باب مواضع قسم الخمس ج ۲ ص ۴۱۹ (۵) موطا امام مالک کتاب الزکوۃ، زکوۃ الاموال الیتمٰی ص ۱۰۶ و زکوۃ الحلی و کتاب الطلاق (۶) مسند احمد ج ۶ ص ۲۶۹ (۷) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی ج ۱ ص ۴۲ و مسند ج ۶ ص ۳۲ (۸) ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیماً ص ۳۰ (۹) استیعاب ابن عبدالبر تذکرہ ابوالدحداحؓ ج ۲ ص ۶۶۳۔

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، مگر اگر یہ سوال کیا جائے کیا محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان، جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لئے بھی امن وراحت کے گھر بنائے، ان کے وظیفے مقرر کئے، مکتب قائم کئے، جائدادیں وقف کیں، (۱) اور دنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی وسرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں، ان کی جائدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں (۲)، اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے اور لندن کے لارڈ میریا آرفنس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

☆

---

(۱) تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔ (۲) حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی له (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں۔ قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک

یتیموں کے بعد اصنافِ انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنسِ لطیف کے ان افراد کا ہے، جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا ہے، اب وہ بے یار و مددگار اور بے مونس و غم خوار ہیں، نہ ان کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ ان کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے، عورت جس کو خدا نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی، اب وہ ناچاران سے دوچار ہے، اب غم والم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں، دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعیں کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی، وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا، عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا، عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون جاتا رہا، مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو نہ پیش کر سکا، ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی، اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مر جانا چاہئے اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علاحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گذار دے، عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کر سکتے تھے، اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریادرسی ہوئی، اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا اور صرف اتنی مدت تک کے لئے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہیں، اس کے لئے سوگ

کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی، اور اس کا نام عدت رکھا، یعنی ''شمار کے دن'' اس مدت کے گذر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرائش کی اجازت دے دی، اس کا دین مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اول ضروری ٹھہرایا، پھر اس ترکہ میں سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوایا، عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی اور اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع و قمع کر دیا اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا۔

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے، اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے، اور کسی شریف شریکِ زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کی، بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا:

وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ (نور:۲۴-۳۲) اور اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں، اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ ﷺ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کئے، جن میں سے آٹھ حضرت سودہؓ، حفصہؓ، زینب ام المساکینؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں، جن کی کفالت کا بار آپ ﷺ نے اپنے دوشِ مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیرووں کے لئے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔

یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ ﷺ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب

حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والا بہ آسانی کر سکتا ہے، فرمایا:

الساعی علی الارملة والمسکین کالساعی فی سبیل اللہ واحسبہٗ قال کالقائم لایفتر وکالصائم لایفطر (۱)

بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے والا (اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ وکالذی یصوم النھار ویقوم اللیل (۲)

بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا، خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں، اور اس لئے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں، لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں، جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علاحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں، یہ فرمایا ”میں اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے، وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے یہاں تک کہ وہ اس سے علاحدہ ہو جائیں، یا مر جائیں (۳)“، اسی مقصد کو ابو یعلیٰ کی مسند میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ ”قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا تو کون ہے تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے“ (۴)۔

---

(۱) صحیح بخاری وصحیح مسلم وموطا امام مالک بحوالہ مشکوٰۃ باب الشفقة والرحمة علی الخلق ص:۴۰۰ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب الساعی علی الارملة ج۲ ص۸۸۸ (۳) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتامی ج۲ ص۷۰۱ (۴) حاشیہ صفحہ مذکور سنن ابی داؤد بتحشیة ابی الحسنات محمد بن عبداللہ ابن نورالدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے، اس لئے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (ذاریات:۵۱-۱۹)	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لئے حق ہے۔
فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ. لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (معارج:۷۰-۲۴،۲۵)	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کے لئے مقررہ حق ہے۔

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں، لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہو سکتا ہے، جو تم سے کسی مالی مدد کا خواست گار ہو، محروم کی تشریح میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے، بعض اس کو محروم کہتے ہیں جس کا مالِ غنیمت میں کوئی حصہ نہیں، کسی نے اس کے ظاہر معنی لئے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو، کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو، اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو، اس معنی کی تائید اہلِ لغت (۱) اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآن پاک (۲) سے ہوتی ہے۔

---

(۱) دیکھو لسان العرب لفظ محروم ومحارف (اس مفہوم کی تائید لسان العرب کے محولہ بالا مقامات پر نہیں ملے گی۔) (۲) تفسیر ابن جریر میں سورہ ذاریات ج۲۶ ص۱۱۲ ومعارج کی آیت مذکورہ ج۲۹ ص۴۵ اور سورہ قلم ج۲۹ ص۱۹ میں اصحاب الجنۃ کے قصہ میں محرومون اور سورہ واقعہ ج۲۷ ص۱۰۳ میں بل محرومون کے معنی میں ملاحظہ کیجئے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے یا عام صدقہ، مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق ''حق'' کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے، اور معارج میں جس میں مطلق ''حق'' کا نہیں بلکہ ''مقررہ حق'' کا بیان ہے ''زکوٰۃ'' مراد ہو، کیوں کہ ''مقررہ حق'' کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں، بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو، دونوں طرح سے مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے:

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ. (الضحیٰ:۹۳-۱۰) اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر۔

یہاں ''سوال کرنے والے'' کے معنی اغنیٰ کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر لفظ کا عموم وسعت چاہتا ہے، یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواست گار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو(۱) یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے، اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوب صورتی سے عذر کرو۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا. (نساء:۴-۸۵)

جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا اور جو بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہے ہر چیز کا نگہ بان۔

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقت ور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے، تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام

(۱) طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے واما من سالک من ذی حاجة فلا تنهر ج ۳۰ ص ۱۲۸ ازمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے۔ ج ۲ ص ۱۶۱۶۔

کی سفارش تک وسیع ہے، اوراس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا ایسا ہی برے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ. (مائدہ:۵-۲)

اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو، اور ڈرو اللہ سے بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا، اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا، ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے، جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہئے، آنحضرت ﷺ نے گویا ان ہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

من كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة(۱)

جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

والله في عون عبده ما كان العبد في عون اخيه (۲)

اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ ﷺ صحابہؓ سے فرماتے کہ ”تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا“ (۳) ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ

---

(۱) صحیح بخاری کتاب المظالم باب لایظلم المسلم ج ۱ ص ۳۳۰ و صحیح مسلم (۲) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء في الستر على المسلمين ج ۲ ص ۱۴ (۳) صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنين ج ۲ ص ۸۹۰ وباب قول الله من يشفع شفاعة حسنة ص ۸۹۱۔

اگر کچھ اور نہ ہوسکے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو (۱)، یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے (۲)، یہ بھی ارشاد ہوا کہ جو شخص راستہ چلتے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹادے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے (۳)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقة ج۲ص۸۹۰ (۲) ترمذی کتاب البر والصلة باب ماجاء فی صنائع المعروف ص۱۷ (۳) ایضاً باب ماجاء فی اماطة الاذی عن الطریق ص۱۷۔

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہم دردیوں کا مستحق ہے، بیماروں اور مریضوں کا ہے، یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غم خواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں ''عیادت'' (۱) ہے۔

ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے، ان کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن نے اس کے لئے ایک کلی اصول بنا دیا ہے:

(۱) عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں، یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں اور اس کی تیمارداری، غم خواری اور خدمت گزاری کے بھی ہیں، بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غم خواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گزاری کرے، عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانے میں تھا، کہتا ہے:

ذهب الرقاد فما يحسس رقاد　　　مما شجاک ونامت العواد

تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی، اور عیادت کرنے والے سو گئے۔

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار کے تیماردار اور خدمت گزار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں جاگتے کٹ جاتی ہیں، لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا وہ مر جاتا ہے تو ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں، اب اگر ''عیادت'' کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا، اس سے ظاہر ہوا کہ ''عیادت'' کی وسعت میں خدمت گزاری اور تیمارداری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کو دیکھنے جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ جب صرف اس کو دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت گزاری اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہو گا۔

وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ (نور:۲۴-۶۱) اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ (فتح:۴۸-۱۷) نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ (توبہ:۹-۹۱) نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)۔

بیماروں کے لئے وضو معاف ہے:

وَإِنْ كُنتُم مَّرْضَىٰ (مائدہ:۵-۶) یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو۔

اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں:

عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ (مزمل:۷۳-۲۰) خدا کو معلوم تھا کہ تم میں سے کچھ بیمار بھی ہوں گے۔

اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لئے رعایت فرمائی گئی ہے:

فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا (بقرہ:۲-۱۸۴) تو تم میں جو بیمار ہو۔

روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز کی رخصت دی گئی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دئے تو بندوں کو کس حد تک ان سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہئے۔

اسلام نے مسلمان کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بہ جائے خوش خبری بنا دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذابِ شدید سے بچانے کے لئے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں اور وہ پاک وصاف ہو جاتا ہے(۱)۔

آنحضرت ﷺ نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے، اس کے آداب تعلیم کئے ہیں، اس کی دعائیں سکھائی ہیں اور اس کا ثواب بتایا ہے، فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب ثواب المومن فیما یصیبه ج۲ ص۳۸۵ و سنن ابی داود کتاب الجنائز باب الامراض المکفرة للذنوب ج۲ ص۳۶۔

خدا آخرت میں اس کے غم کو ہلکا کرے گا(۱)، اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے(۲)، صحابہؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا، جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے(۳)، ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لئے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں(۴)، یہ بھی آیا ہے کہ ''جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے''(۵)، فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لئے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی اور دلاسا دے اور اس کو شفا پانے کے لئے خدا سے دعا کرے(۶)۔

آنحضرت ﷺ اور آپ کی تعلیم سے صحابۂ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی، آپ ﷺ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے(۷)، منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں(۸)، اور اسی سے علما نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے(۹)۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا تا کہ بار باران کی عیادت کی جا سکے،(۱۰)، رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں، جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں، ان کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا تا کہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں(۱۱)، غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بی بیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں(۱۲)۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم (۲) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب الامر باتباع الجنائز ج۱ص۱۶۶ (۳) ایضاً (۴) سنن ابی داؤد کتاب الجنائز باب فضل العیادۃ ج۲ص۳۶ (۵) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل عیادۃ المریض بطرق مختلفۃ ج۲ص۳۸۳ (۶) سنن ابی داؤد کتاب الجنائز (۷) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اذا اسلم الصبی الخ ج۱ص۱۸۱ (۸) سنن ابی داؤد کتاب الجنائز باب العیادۃ ص۴۴۱ (۹) مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ ج۳ص۶۹۵ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۹۷۱ء (۱۰) سنن ابی داؤد کتاب الجنائز باب فی العیادۃ مراراً ص۳۶ (۱۱) سیرۃ ابن ہشام غزوہ بنی قریظہ ج۲ص۷۰ و ادب المفرد بخاری بـاب کیف اصبحت واصابہ ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھئے (۱۲) صحیح مسلم کتاب الجہاد باب غزوۃ النساء ج۲ص۱۰۳۔

آپ ﷺ نے اپنے پیرووں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ ''بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو''(۱)۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل موثر و دل کش طرزِ ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ ''اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی'' وہ کہے گا ''اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا پروردگار تھا میں تیری عیادت کیوں کرتا'' فرمائے گا ''کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا، مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا''(۲)۔

تعلیم کی یہ طرزِ ادا، بیمار پرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غم خواری کی کیسی دل نشین تلقین ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو ان بیماروں کی خدمت کر کے خدا کا قرب پاتے ہیں۔

---

(۱) مسند احمد ج۴ ص۳۹۴ (۲) صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب فضل عيادة المريض ج۲ ص۳۸۴۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے، ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بن کر عیش وراحت، سیر وتفریح اور حکومت وشہنشاہی کے کام کیے اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشت کاری اور محنت ومزدوری کے مشقت والے کام لئے، ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت ومحنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے، اور عربوں میں بھی ان کے ساتھ یہی برتاؤ تھا، بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم وستم کا تختۂ مشق تھا، کیوں کہ اس کو اپنی حفاظت کے لئے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔

اسلام زیردستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جس معاہدۂ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے، وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا، کہ ان زیردستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے، اسی لئے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا، چنانچہ زیدؓ ابن حارثہ، خبابؓ بن الارت، بلال حبشیؓ، یاسر یمنیؓ، عمارؓ، صہیب رومیؓ، ابوفکیہہؓ، عامرؓ بن فہیرہ اور سالمؓ غلاموں میں اور لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ اور سمیہؓ لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں اور زیدؓ بن حارثہ کے سوا جو آنحضرت ﷺ کے سایہ میں پرورش پارہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جز

بنالیا تھا، غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورۂ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، جن کاموں کو ''گھاٹی'' بتایا گیا ہے، ان میں ایک فَکُّ رَقَبَةٍ ''گردن سے غلامی کی رسی کو کھولنا'' بھی ہے، چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اہلِ ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

مدینہ آ کر اس تحریک نے اور فروغ پایا، تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ یعنی گردن کو آزاد کرنا، بہت سی فروگذاشتوں کا کفارہ قرار پایا اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لئے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا، صحابہؓ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی، حضرت حکیمؓ بن حزام نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں، اسلام کے بعد سو غلام آزاد کئے (۱)، حضرت عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد کئے (۲)، حضرت عبداللہؓ بن عمر نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی (۳)۔

شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جائے، ان بندوں میں سرِ فہرست جن لوگوں کے نام ہیں، ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے، فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا. (نساء:۴-۳۶)	اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور عزیز پڑوسی اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور پہلو کے رفیق کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے، لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے، بلکہ فتای میرا جوان کہے،

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان حکم عمل الکافر اذا اسلم بعدہ ج ۱ ص ۶۱ (۲) صحیح بخاری ج ۲ کتاب الآداب باب الھجرۃ ص ۸۹۷ (۳) یہ دونوں تعدادیں امیر اسمٰعیل نے سبل السلام شرح بلوغ المرام کتاب العتق ج ۲ ص ۲۳۵ مطبع فاروقی دہلی ۱۳۱۱ھ میں نقل کی ہیں۔

اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں، بلکہ مولیٰ کہیں (۱)، اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کردیا اور فرمایا کہ ”یہ جن کو تم غلام کہتے ہو، یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہارے تحت میں کردیا ہے، پس جس کو خدا نے تمہارے تحت میں کردیا ہے تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دو جو اس پر بھاری ہو جائے اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے“ (۲)۔

حضور ﷺ کے اس حکم پر صحابہؓ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی (۳)، ان بے خانماں افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا کہ جس کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار ہوگا (۴)، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو، جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں (۵)، ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنا دیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس کی تفصیل آیندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب العتق باب کراھیۃ التطاول علی الرقیق ج ۱ ص ۳۴۶ (۲) صحیح بخاری ج ۲ کتاب الآداب باب ماینھی عن السباب ص ۸۹۴ (۳) ایضاً ص ۸۹۳ (۴) حدیث میں ہے انما الولاء لمن اعتق، ولا کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے، دوسری حدیث میں او انتمیٰ الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر خدا کی لعنت، امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل ھو لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولا کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے (صحیح مسلم کتاب العتق) (۵) کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر ص ۲۳۵۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹرانوں نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گذشتہ نظامِ تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے، اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا، گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں، لیکن اہلِ عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا، مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں کا ذکر سورہ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے:

هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ الْمُکْرَمِیْنَ. اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ. فَرَاغَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ. فَقَرَّبَهٗٓ اِلَیْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْکُلُوْنَ. فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (ذاریات:۵۱-۲۴ تا ۲۸)	(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے؟ کہ جب (یہ لوگ) ان کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا، (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں، پھر جلدی سے اپنے گھر جا کر (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لئے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو (انہوں نے تامل کیا، ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں، (اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے، انہوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا)

اندیشہ نہ کریں اور ان کو ایک ہشیار فرزند کی خوش خبری بھی دی۔

اس حکایت سے آدابِ مہمان داری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جاسکتے ہیں:

۱- مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہئے۔

۲- مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہئے کیوں کہ ''روغان'' کے معنی سرعت کے ہیں۔

۳- روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں، اس لئے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ بچا کر کرنا چاہئے، کیوں کہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لئے کچھ سامان کیا جا رہا ہے تو وہ از راہِ تکلف اس کو روکیں گے، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔

۴- کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لئے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہئے، تا کہ ان کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ کھانے پینے کا سامان کرنے کے لئے ان سے الگ ہو گئے۔

۵- مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا۔

۶- کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہئے، ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہئے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے، یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیے۔

۷- مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہئے، کیوں کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے، تا کہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل وعیال کے کام آئے، اسی لئے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیمؑ نے اس کو ناپسند کیا اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

۸- نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہئے، اسی لئے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہئے، کیوں کہ ہم لوگ کھاپی نہیں

سکتے، بلکہ صرف آپ کوایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لئے آئے ہیں۔

سورہ حجر میں حضرت لوطؑ کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام وآسایش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت وآبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے، کیوں کہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے، اسی لئے جب قوم لوطؑ نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوطؑ نے:

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ. وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ. (حجر:۶۸-۱۵)	کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو اور خدا سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مکارمِ اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمانِ کامل کا ایک جز قرار دیا اور فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے"، کہا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ "ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے، اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا" (۱)، نیز فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے" (۲)۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا بے شک، فرمایا ایسا نہ کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے، اور تمہاری بی بی کا حق ہے" (۳)۔

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ ص۸۸۹ (۲) بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمته ایاہ بنفسه وقوله تعالیٰ ضیف ابراھیم المکرمین ص۹۰۶ (۳) بخاری کتاب الادب باب حق الضیف ص۹۰۵۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے، پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے، چاہے وہ لے لے چاہے چھوڑ دے''(۱)۔

چوں کہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لئے بہر حال ایک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم کی ہدایت کی گئی ہے وہاں مہمان کو بھی یہ بتادیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوانِ کرم سے حدِ ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کردی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہرنا چاہئے، کیوں کہ اس سے صاحبِ خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا(۲)، اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہوجائے گی، جس کو خود غیور اور خوددار مہمان پسند نہ کرے گا۔

☆

(۱) ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف ص ۲۷۰ (۲) بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ ج۲ ص ۹۰۶۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا، ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے، اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔

آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے، اور وہ دین کا رشتہ تھا، جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا، دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی وقبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کردی، جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کردیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران: ۳-۱۰۲،۱۰۳)

اے مسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور نہ تم مرو لیکن مسلمان اور خدا کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پھر تم بھائی بھائی ہوگئے۔

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کرسکتا تھا:

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (انفال: ۸-۶۳)

اور خدا نے مسلمانوں کے دل ملا دئے، اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کردیتا تب بھی تو ان کے دلوں کو ملا نہ سکتا، لیکن خدا نے ملا دیا، بے شک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا اور مصلحت جاننے والا ہے۔

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں، اور سب مل کر خدا کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے مضبوط پکڑیں اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں، کیوں کہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں، فرمایا:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (انفال:۸-۴۶)

اور اللہ اور رسول کا کہا مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، (کہ ایسا ہوگا تو) ہمت ہار دو گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

یہی باہمی اتفاق و اتحاد ملت اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت ہو، اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آجائے تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (نساء:۴-۵۹)

تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرا دیں:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (حجرات:۴۹-۹،۱۰)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو تو اگر وہ رجوع کرلے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، خدا منصفوں کو دوست رکھتا ہے، مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں، تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے، یہ رشتہ جنگ و خوں ریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا، ان ہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

انصر اخاک ظالما او مظلوما (۱) — تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیوں کر کی جائے، فرمایا اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔

کیسا ہی بڑا سے بڑا کافر اور سخت سے سخت دشمن ہو جس وقت اس نے کلمۂ شہادت پڑھا اور شریعت اسلامی کو قبول کیا وہ دفعتاً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا، خدا نے فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (توبہ:۹-۱۱) — تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز کھڑی کریں، اور زکوۃ دیں تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہیں۔

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا، اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں، وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا:

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (احزاب:۳۳-۵) — تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علاقہ مند۔

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کردے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اس کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (بقرہ:۲-۱۷۸) — تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے، کیوں کہ:

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا (حجرات:۴۹-۱۲) — کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا متولیوں کا فرض ہے اور اگر وہ ان کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ ان کو اپنے کنبہ کا جز بنالیں اور ملا جلا کر خرچ کریں تو یہ بھی درست ہے، کیوں کہ یہ ان کے بھائی ہیں، جن کی خیر خواہی ان کا فرض ہے، فرمایا:

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (بقرہ:۲-۲۲۰) — اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے، کیوں کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری ابواب المظالم والقصاص باب اعن اخاک ظالما او مظلوما ج ۱ ص ۳۳۰۔

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں، وہ یوں کہتے ہیں:

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (حشر:۵۹-۱۰)	اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر۔

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے جس کے دور کرنے کے لئے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہئے اور کہنا چاہئے:

وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (حشر:۵۹-۱۰)	اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے، اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے۔

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم وشفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں، خدا نے مدح فرمائی:

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح:۴۸-۲۹)	وہ (مسلمان) آپس میں رحم وشفقت رکھتے ہیں۔

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (مائدہ:۵-۵۴)	مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے، ''مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسمِ انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضا بخار اور بےخوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں'' (۱)، صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا ''سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں، کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے'' (۲)، مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں، بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ درد ہو تو

(۱) صحیح بخاری ج۲ص ۸۸۹ كتاب الادب باب رحمة الناس والبهائم وصحیح مسلم ج۲ص ۳۸۹ كتاب البر والصلة والآداب باب تراحم المومنين وتعاطفهم وتعا ضدهم مصر (۲) صحیح مسلم ج۲ص ۳۸۹ مصر كتاب البر والصلة والآداب باب تراحم المومنين الخ۔

سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہئے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہئے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے'' (۱)، بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، اس تمثیل میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابل تسخیر حصن وحصار بن جاتی ہے، اسی طرح جماعتِ اسلامیہ ایک قلعہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے، یہ قلعہ اس وقت تک محفوظ ہے جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے، جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آ جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے، اور نہ اس کی تحقیر کرے ....، انسان کے لئے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو'' (۲)، یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا'' (۳)۔

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا ''جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا اور جو

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین بعضهم بعضاً ج۲ ص۸۹۰ وابواب المظالم والقصاص باب نصر المظلوم ج۱ ص۳۳۱ و صحیح مسلم کتاب البر والصلة والآداب ج۲ ص۳۸۹ باب تراحم المومنین الخ مصر

(۲) صحیح مسلم کتاب مذکور باب تحریم ظلم المسلم وخذله ج۲ ص۳۸۲ مصر (۳) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج۲ ص۱۹۰ باب المواخاة ص۶۷۰ کلکتہ۔

کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے''(۱)۔

فرمایا ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں''(۲)، یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے، دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے، فرمایا، ''جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں''(۳)، یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔

جریرؓ بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے کہتے ہیں کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا''(۴) کئی روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے اور اس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے''(۵)، یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح وآشتی کا حکم دیا ہے، اب جو اس کے خلاف کرتا ہے، وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں خدا کا انکار ہی ہے، چنانچہ اسی لئے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کے لئے مخصوص ہے، فرمایا ''کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے الّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے'':

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا. (نساء:۴-۹۳)

اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، وہ اس میں پڑا رہے گا، اور خدا اس پر خفا ہوا اور لعنت کی، اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا۔

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ ﷺ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا پھر فرمایا: ''دیکھو

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۶۹۴ باب فی المعونة للمسلم ص ۶۷۶ (۲) صحیح بخاری کتاب الایمان باب المسلم من سلم المسلون الخ ج ۱ ص ۶ (۳) ایضاً باب ای الاسلام افضل ج ۱ ص ۶ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام ج ۱ ص ۳۶ مصر (۴) صحیح بخاری کتاب الایمان باب قول النبی ﷺ الدین النصیحة الخ ج ۱ ص ۱۳ (۵) ایضاً باب خوف المومن ان یحبط عمله ج ۱ ص ۱۲ و کتاب الادب باب ما ینهی عن السباب واللعن ج ۲ ص ۸۹۳۔

میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو'' (۱)، ایک اور موقع پر فرمایا کہ ''جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں'' (۲)۔

جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا ''سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے'' (۳)، اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا ''جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو اور اس کی آبرو جاتی ہو تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا'' (۴)۔

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت ﷺ نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ ''کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کی ابتدا کرے'' (۵) ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، ''آپس میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو، اے خدا کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ اور کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے'' (۶)۔

ایک مسلمان کے لئے اس کی عزت آبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے، قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہارِ اسلام کے لئے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (نساء:۴-۹۴)	اور اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے، یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔

(۱) صحیح بخاری کتاب العلم باب الانصات للعلما ج۱ص۲۳ و کتاب الدیات باب قول اللہ ومن احیاھا ج۲ ص۱۰۱۴ و۱۰۱۵ (۲) ایضاً ص۱۰۱۵ و کتاب الفتن باب قول النبی ﷺ من حمل علینا السلاح فلیس منا ج۲ ص۱۰۴۷ (۳) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج۲ص۱۸۹ باب فی الغیبۃ ص۶۶۹ کلکتہ (۴) ایضاً باب رجل یذب عن عرض اخیہ ص۶۶۹ (۵) صحیح بخاری کتاب الادب باب الھجرۃ ج۲ص۸۹۷ و سنن ابی داؤد کتاب الادب ج۲ ص۱۹۲ باب فی ھجرۃ الرجل اخاہ ص۶۷۳ کلکتہ (۶) صحیح بخاری کتاب الادب باب الھجرۃ ج۲ص۸۹۷۔

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے، کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں، ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا، اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا، مگر اس پر بھی ان صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا، یہ خبر آنحضرت ﷺ تک پہنچی، آپ ﷺ نے ان کو بلا کر دریافت کیا، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپ ﷺ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا "تم اس کے لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے" ایک روایت میں ہے کہ فرمایا "کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا" (۱)۔

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ "مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے" (۲)، یہ بھی فرمایا کہ "جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا" (۳)، یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے۔

جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ "جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو خدا اس کے لئے دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا، ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی، فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو" (۴)۔

فرمایا ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، اس کے چھینکنے پر خدا تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا" (۵)، یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسنِ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، ارشاد ہوا کہ "جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے" (۶)، حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ

---

(۱) پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقات کتاب المغازی باب بعث النبی ﷺ اسامة بن زید الی الحرقات من جهينة ج ۲ ص ۶۱۲ اور کتاب الدیات باب قول اللہ ومن احیاها ج ۲ ص ۱۰۱۵ میں ہے دوسری روایت کے لئے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور ج ۱۲ ص ۱۷۲ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب ماینهی عن السباب واللعن ج ۲ ص ۸۹۳ (۳) ایضاً باب من اکفر اخاه الخ ج ۲ ص ۹۰۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان حال ایمان من قال لاخیه المسلم یا کافر ج ۱ ص ۴۳ مصر (۴) صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم الخ ج ۱ ص ۶۵ مصر (۵) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۲۰۱ باب فی العطاس ج ۲ ص ۶۸۶ کلکتہ (۶) صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۴ کتاب البر والصلة باب فی فضل عیادة المریض۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی ایمان واخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے، جن میں سے ہر رتی احد کے پہاڑ برابر ہوگی'' (۱)، یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہوگی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہوسکتا، اس برادرانہ الفت ومحبت کے فروع ہیں جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے'' (۲)، الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے'' (۳)۔

دیکھئے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں جیسی آج ہیں، ہر جماعت ان ہی اصولوں پر دنیا میں بنی ہے اور آئندہ بھی بنے گی۔

☆

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان باب اتباع الجنائز ج۱ص۱۲ (۲) صحیح بخاری کتاب الایمان باب من الایمان ان یحب لاخیه مایحب لنفسه ج۱ص۶ (۳) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی النصیحة ج۲ص۶۷۳، تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے، تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے، اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ:۲-۸۳) اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا، انسانیت کا فرض ہے، جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے، اسی لئے ارشاد ہوا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ:۵-۸)

اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو، کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔

ہر قسم کا برا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لئے آمادہ رہتا ہے، یہ آیت پاک انسان کے اسی مادۂ فاسد کے سر چشمہ کو بند کرتی ہے، ابو ہریرہؓ اور انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاتباغضوا ولا تحاسدوا ولاتدابروا وكونوا عبادالله اخوانا(۱)

آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب الهجرة ج۲ص ۸۹۷۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں:

لاتنا جشوا ولا تحاسدوا ولاتدابروا وکونوا عباداللہ اخوانا(۱)

آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ نہ دو اور ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے کینہ رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منھ پھیرو اور اے خدا کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے، جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعتاً جنت بن جائے، فرمایا، من لا یرحم لا یُرحم (۲) ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا''، جو بندوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر خدا رحم نہیں کرتا یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا'' مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا'' (۳)، یہ حدیث رحمۃ للعالمین ﷺ کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا'' (۴)، اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے، ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا، جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا، صحابہؓ نے پوچھا اے خدا کے رسول ﷺ! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے، فرمایا: ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے، یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے، نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے، (۵) اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا ''جہاں بھی ہو خدا کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے اور لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آؤ'' (۶)، ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے پانچ باتیں گنائیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ واحب للناس ما تحب لنفسک یعنی ''تم لوگوں (ناس) کے لئے وہی چاہو جو اپنے

(۱) بخاری کتاب الادب باب ماینھی عن التحاسد الخ ج۲ص۸۹۶ (۲) ایضاباب رحمۃ الناس والبھائم ج۲ص۸۸۹ (۳) مستدرک حاکم کتاب البر والصلۃ ج۴ص۱۵۹ (۴) و (۵) یہ حدیثیں صحیح بخاری ج۲ص۸۸۹ کتاب الادب کے باب رحمۃ الناس والبھائم کے مختلف ابواب میں ہیں۔ (۶) صحیح بخاری ابواب البر والصلۃ ج۲ص۱۹۔

لئے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے'' (۱)، الناس کا لفظ عام ہے، جس میں تمام انسان داخل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیوں کہ دوسروں کے لئے وہی چاہنا جو اپنے لئے چاہو، اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے، ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے بھائی کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو'' بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی، تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو'' (۲)، اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علاحدہ باب میں گذر چکا ہے (۳)، اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہئے، کہ صحابۂ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ وخیرات کے باب میں گو فقرا اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی بات ہے تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نا مسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی، اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہوں، حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اس کو کچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو، خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے، اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں، قرآن میں صدقہ کی اجازت فقرا اور مساکین کے لئے ہے، فقرا تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکینِ اہلِ کتاب میں ہیں ان سے جزیہ نہ لیا جائے (۴)۔

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دئے جاسکتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی

(۱) ترمذی آغاز ابواب الزهد غریبٌ ج ۲ ص ۵۶ (۲) عہد نامہ جدید مرقس ۱۲ ص ۳۱ (۳) دیکھئے جلد ہذا (۴) کتاب الخراج قاضی ابو یوسف بھامشه الجامع الصغیر للامام محمد ص ۷۲ مصر۔

رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، ابن جریج محدث کہتے ہیں کہ قرآن (۱) نے ''اسیر'' کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہؓ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے، ابو میسرہؓ اور عمرو بن میمونؒ اور عمروؒ بن شرحبیل صدقۂ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے (۲)، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا (۳) اور خود رسول اللہ ﷺ نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلہ رحمی کی اجازت دی (۴)۔

تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہؓ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری (۵):

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (بقرہ:۲-۲۷۲)	ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے اور جو بھلائی خرچ کرو وہ تمہارے ہی لئے ہے۔

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہر حال ملے گا۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

لا یومن احدکم حتّٰی یحب للناس ما یحب لنفسہٖ وحتّٰی یحب المرء لایحبہ' الا للہ عز وجلّ (۶)	تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے۔

اس حدیث میں محبتِ انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

---

(۱) سورہ دہر:۷۶-۸ (۲) کتاب الاموال امام ابوعبیدہ ص ۶۱۳-۶۱۴ مصر (۳) بخاری کتاب الجمعة باب مایلبس احسن مایجد ج ۱ص ۱۲۲ (۴) مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل النفقة الصدقة علی الاقربین ج ۱ص ۳۲۴ (۵) طبری ج ۳ص ۵۸ (۶) ج ۳ص ۲۷۲۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف ومحبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، وہ جانوروں کو اندھادھند مار کر گرادیتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست واحباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعارِ عرب میں موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا، ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے، اسلام آیا تو اس نے اس سنگ دلی کو مٹا دیا، عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے (۱)، ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جان دار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گذر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ان کو ملعون قرار دیا ہے (۲)، اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آکر یہ حالت

(۱) ترمذی ابواب الصید باب ما جاء فی کراھیۃ اکل المصبورۃ ص ۲۵۵ ج ۱ ص ۲۷۲ مطبوعہ دیوبند (۲) بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ ج ۲ ص ۸۲۹۔

دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کو جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے، وہ مردار ہے (۱)، یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی (۲)۔

بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا (۳)، ایک حدیث میں ہے کہ ''کسی نے اگر کنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پرس کرے گا'' صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے (۴)، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں، ان کا مارنا جائز نہیں، سنن نسائی میں ہے کہ ''جو شخص کنجشک کو بلاضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد کرے گی، کہ فلاں نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا'' (۵)، جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، ان کا مارنا بھی جائز نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے (۶)۔

جو جانور ضرورتاً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں، ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقہ سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو، تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کرلے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے (۷)۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو

---

(۱) ترمذی ابواب الصید باب ماجاء ما قطع من الحی فھو میت ج ۱ ص ۲۷۳ (۲) بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ ج ۲ ص ۸۲۹ (۳) مستدرک حاکم کتاب النکاح اعظم الذنوب عنداللہ ج ۲ ص ۱۸۲ (۴) مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح الفصل الثانی ص ۳۵۰ ج ۲ ص ۴۲۷ مطبوعہ دمشق ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء (۵) نسائی کتاب الضحایا ص ۶۷۹ باب ذبائح الیھود من قتل عصفوراً الخ ج ۲ ص ۱۸۵ و کتاب الصید والذبائح اباحۃ اکل العصافیر ج ۲ ص ۱۷۸ (۶) مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۶۲ (۷) مسلم باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ ج ۲ ص ۱۵۸۔

خدا تم پر رحم کرے گا (۱)، یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی (۲)، کیوں کہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر، پتھر، یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہوسکتا نہ دشمن شکست کھاسکتا، البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے (۳)، مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں، جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے، اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مر گئی، (۴) بلکہ لوگ چوں کہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں، اس لئے وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ گنہ گار ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو اگر خدا ان کو معاف کردے تو سمجھو کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کردئے (۵)۔

ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ ؓ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے، آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے جہاں زمین میں یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے، ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! یہ میں نے کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ (۶) (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو یا جل نہ جائیں)۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انہوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلادیا، اس پر خدا نے ان کو وحی کے ذریعہ متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا (۷)، یعنی قصاص کی مستحق صرف

---

(۱) مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۳۶ (۲) نسائی ص ۶۷۴ کتاب الضحایا باب النهی عن الذبح فی الظفر باب فی الذبح بالسن ج ۲ ص ۱۸۲ (۳) بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقة ج ۲ ص ۸۲۳۔ (۴) بخاری کتاب الانبیاء آخر باب ج ۱ ص ۴۹۵ (۵) مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۴۴۱ (۶) ایضاً ج ۱ ص ۳۹۶ عن عبداللہ بن مسعودؓ (۷) بخاری کتاب بدء الخلق باب خمس من الدواب الخ ج ۱ ص ۴۶۷۔

وہی ایک چیونٹی تھی، جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا، ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفرِ جہاد میں صحابہ کرامؓ ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا فرطِ محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے، اس کے بچوں کو چھوڑ دو صحابہ کرامؓ نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لئے سزاوار ہے (۱)۔

اسی طرح اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے بعینہٖ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجبِ ثواب ہے، اسی عدمِ واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لئے پانی کے جو حوض بنائے ہیں، ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہیں، اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے (۲)۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی، اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنویں میں اتر کر پانی پی لیا، کنویں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے اور کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا اور کنویں میں اتر کر پانی لایا اور اس کو پلایا، خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا، اور خدا نے اس کو بخش دیا، صحابہ کرامؓ نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجبِ ثواب ہے (۳)، صرف جان داروں ہی تک نہیں، بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ (۴) یعنی ثواب کا کام ہے۔

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول

(۱) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی کراهية حرق العدو بالنار ج۲ص۳۶۳ (۲) ابن ماجه ابواب الادب باب فضل صدقة الماء ص۲۷۰ مطبوعہ دیوبند (۳) بخاری کتاب الادب باب رحمة الناس والبهائم ج۲ص۸۸۸ (۴) بخاری ابواب الحرث والمزارعة باب فضل الزرع والفرس اذا کل منه ج۱ص۳۱۲۔

بتائے یعنی:

۱- جو جانور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے وہی کام لینا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں، صرف کھیتی باڑی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں (۱)، نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے ان کو تمہارا فرماں بردار صرف اس لئے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے، تمہارے لئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو (۲)، اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہئے۔

۲- جانورں کے آرام و آسایش کا خیال رکھنا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ (۳)، تا کہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے، ایک بار آپ ﷺ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا، ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ (۴)۔

ایک بار آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں رفعِ حاجت کے لئے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہو گیا، آپ ﷺ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ "میرا یا رسول اللہ ﷺ" فرمایا اس جانور کے بارہ میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے، خدا سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو (۵)۔

---

(۱) بخاری ابواب الحرث والمزارعة باب استعمال البقر للحراثة ج ۱ ص ۳۱۲ (۲) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الوقوف علی الدابة ج ۱ ص ۳۴۷ (۳) مسلم کتاب الامارة باب مراعاة مصلحة الدواب فی السیر والنهی عن التعریس فی الطریق ج ۲ ص ۱۴۵ (۴) و (۵) ابوداؤد کتاب الجهاد باب مایومر به من القیام علی الدواب والبهائم ج ۱ ص ۳۴۵۔

۳- جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا(۱)۔

۴- جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا(۲) کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے تا کہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے، وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

(۱) ابوداؤد کتاب الجهاد باب النهی عن الوسم فی الوجه والضرب فی الوجه ج۱ص ۳۴۶، ۳۴۷۔

(۲) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی التحریش بین البهائم ج۱ص ۳۴۶۔

فضائلِ اخلاق

اخلاقِ حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک امہاتِ اخلاق اور دوسری فروعِ اخلاق، امہاتِ اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی وبیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے اعتدال سے فضائلِ اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوت علمیہ، قوت شہوانیہ اور قوت غضبیہ، قوت علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوت شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوت غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے اور ان ہی کے عدم اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھر ان دونوں قسموں کے اختلافِ مدارج سے اچھے اور برے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ تقسیمیں محض فلسفیانہ ہیں، یا یوں کہئے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں، بلکہ عملی ہے، کیوں کہ اس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا حامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لئے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لئے اپنی تعلیم میں اس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیا علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی برائیاں اور خلقِ خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں، وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے، یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہیں، ہم نے اوپر

''اخلاق اور محبتِ الٰہی'' کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیثِ شریفہ میں جا بہ جا ان کی تصریح ہے، لیکن ان کے بیان میں اخلاقِ شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لئے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہئے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتابِ الٰہی اور پیامِ نبوی ﷺ میں زیادہ زور دیا گیا ہو اور جو بہ جائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور غور وفکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست: جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے یا ان اوصاف والوں کے لئے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآنِ پاک اور احادیثِ نبوی ﷺ میں جا بہ جا ان کی تفصیل ہے، جیسے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ. اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ. فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ	ایمان والے مراد کو پہنچ گئے، جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو بے کار باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے کہ ان پر کوئی الزام نہیں، تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی اصلی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ

يُحَافِظُوْنَ. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ. الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ.

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(مومنون:۲۳-۱تا۱۱)

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں: نکمی اور بے کار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاک دامنی، امانت داری اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ

(بقرہ:۲-۱۷۷)

اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا اور نماز کھڑی کی اور زکوۃ دی اور اپنے قول کو جب انہوں نے اقرار کرلیا پورا کرنے والے، اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے بل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں، سخاوت، قول و قرار کو پورا کرنا، اور مشکلوں میں ثابت قدمی۔

سورۂ آل عمران میں ہے:

الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ

(آل عمران:۳-۱۷)

ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے والے اور (خدا کی) فرماں برداری کرنے والے اور (خدا کی) راہ میں خرچ کرنے والے۔

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو خدا کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.

(آل عمران:۳-۱۳۴)

جو خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (خدا کے نام) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس اوپر کی آیت میں فیاضی ،عفو و درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے سورہ معارج میں ہے:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ. لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ .وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ. وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ. اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ. فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ . وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ.

(معارج:۷۰-۲۴تا۳۳)

اور جن کے مال میں مانگنے والے اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے کہ اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں، جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

ان آیتوں میں سخاوتِ نفس،عفت و عصمت،امانت داری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔

سورۂ احزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشایش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے:

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمٰتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ

(احزاب:۳۳-۳۵)

اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں،صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔

ان میں سچائی،صبر،عاجزی اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے:

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (فرقان: ۲۵-۶۳)

(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین میں ہولے چلتے ہیں اور جاہل جب ان سے (جہالت کی) باتیں کریں تو وہ کہیں سلامت رہئے (۱)۔

(۲) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (فرقان: ۲۵-۶۷)

اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔

(۳) وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (فرقان: ۲۵-۶۸)

اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔

(۴) وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ (فرقان: ۲۵-۷۲)

اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بے ہودہ مشغلہ کے پاس سے گذریں تو شریفانہ وضع سے گذر جائیں۔

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری، دوسری آیت میں اعتدال اور میانہ روی تیسری میں عدمِ ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت وسنجیدگی، کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی:

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ۔ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ۔ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ (رعد: ۱۳-۲۰ تا ۲۲)

جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول کو توڑتے نہیں اور جس کے جوڑنے کو خدا نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سہمے رہتے ہیں اور جنہوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لئے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں، ان ہی کے لئے پچھلا گھر ہے۔

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہوسکتا ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جا سکتا ہے جو خدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے،

(۱) یا سلام کہیں۔

وہ اہلِ قرابت اور حق داروں کے حقوق ہیں، ان دو کے سوا ان آیتوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھو دیتے ہیں:

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ. (قصص:۲۸-۸۳)	اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لئے کریں گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے اور آخر انجام پرہیز گاروں کے لئے ہے۔

یعنی غرور و نخوت نہیں کرتے:

وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَاغَضِبُوْاهُمْ یَغْفِرُوْنَ. (شوریٰ:۴۲-۳۷)	اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ. (مائدہ:۵-۴۲)	بے شک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔

عدل و انصاف کی فضیلت کے لئے اس سے بڑھ کر کیا چاہئے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ. (بقرہ:۲-۱۹۵)	بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گذر چکی ہیں اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے، اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آجاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لئے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہوسکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لئے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے، کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں، ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں، ان میں سے جس ایک کو فرمائیے آپ کی خاطر سے چھوڑ دوں، ارشاد ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو، چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا، اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لئے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گذرا کہ صبح کو جب آنحضرت ﷺ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا، اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی، اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف ہوگا، یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا، جب رات زیادہ گذری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لئے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا، ہاں کروں گا تو ہاتھ کٹے گا اور نہیں کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے، اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا، صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں، یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسرور ہوئے (۱)۔

---

(۱) اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورہ ن میں کتب سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے، لیکن مجھے اس کا ماخذ نہیں معلوم ہوا، (تفسیر فتح العزیز پارہ ۲۹ ص ۳۳)۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے کتنی ہی کمزور ہو، مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا، ایمان دار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگوں کو اس کے قول وفعل پر اعتبار ہوگا، جو کہے گا کرے گا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔

صدق، صفاتِ ربانی میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے، خدا سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے، قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں خدا آپ فرماتا ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللهِ حَدِيْثًا (نساء:۴-۸۷) اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے، بات میں۔

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد ہے:

وَعْدَاللهِ حَقًّا ۭوَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللهِ قِيْلًا. (نساء:۴-۱۲۲) وعدہ کیا اللہ نے سچ، اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔

خدا سچا ہے، اس لئے اسی کی ساری شریعت سچی ہے، فرمایا:

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ. (انعام:۶-۱۴۶) اور ہم ہیں سچے۔

قُلْ صَدَقَ اللهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (آل عمران:۳-۹۵) کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا، تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو۔

وَالَّذِيْ جَاۗءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. (زمر:۳۹-۳۳) اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیزگار ہیں۔

اس آخری آیت میں سچائی سے گو مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے، مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہلِ ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں:

وَصَدَقَ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ (احزاب:۳۳-۲۲) اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا۔

چوں کہ رسول خدا سے علم پاتے ہیں اس لئے وہ بھی سچے ہوتے ہیں:

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ. (یٰس:۳۶-۵۲) اور پیغمبروں نے سچ کہا۔

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے، کیوں کہ ان کی ساری باتیں، دعوے، دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا. (مریم:۱۹-۴۱) اور کتاب میں ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس سے نام زد کیا ہے:

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا○ (مریم:۱۹-۵۶) اور کتاب میں ادریس کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

حضرت مریم علیہا السلام جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کیا، اس وصف سے ممتاز ہوئیں، فرمایا گیا:

وَاُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ (مائدہ:۵-۷۵) اور ان (عیسیٰ) کی ماں بڑی سچی تھیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے، بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے:

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ (یوسف:۱۲-۴۶) یوسف! اے بڑے سچے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے باپ سے صبر وشکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا، تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) کا خطاب پایا:

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا○ (مریم:۱۹-۵۴) اور کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کر، بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔

خدا کی خوش نودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی ان میں وہ بھی ہوں گے جو دنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے:

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ (آل عمران:۳-۱۷) صبر کرنے والے اور سچے۔

خدا نے جن لوگوں کے لئے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہیں ان میں اسلام وایمان اور خدا کی فرماں برداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۔ (احزاب:۳۳-۳۵)

بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرماں بردار مرد اور عورتیں، اور سچے مرد اور سچی عورتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔خدا نے ان کے لئے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے:

هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ:۵-۱۱۹) یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا، چنانچہ فرمایا:

لِیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ (احزاب:۳۳-۲۴) تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو اور ان ہی کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو، کعب بن مالکؓ اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکے تھے، ہر قسم کی تکلیفیں سہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے خدا فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ (توبہ:۹-۱۱۹) اے ایمان والو، خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو۔

اہلِ تفسیر کے نزدیک یہاں ان سچوں سے مراد آنحضرت ﷺ اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا، مگر بہر حال آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے بعد بھی یہ آیتِ کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی

دعوت دیتی ہے۔

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں، جس کے لحاظ سے اس کے اندرا کیلئے قول ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن وحدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں، بات میں سچائی ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی، اور دین داری کے مقامات اور مراتب میں سچائی، لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں، یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی: یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول وقرار کو نباہنا بھی اسی قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورۂ احزاب میں ایک آیت ہے:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ (احزاب:۳۳-۲۴)

تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے......

اس آیتِ پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد یعنی بزدل بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہوسکتا ہے، پھر پوچھا کیا بخیل بھی ہوسکتا ہے؟ جواب دیا ہوسکتا ہے، پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا نہیں (۱)، کئی صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مومن ہر خصلت پر پیدا ہوسکتا ہے، لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر نہیں'' (۲)، مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر برائی ہوسکتی ہے مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں

(۱) موطا امام مالک باب ماجاء فی الصدق والکذب ص ۳۸۸ (۲) عن ابی امامۃ عند احمد مسند ج ۵ ص ۲۵۲ وعن سعد بن ابی وقاص عند البزار وابی یعلیٰ والطبرانی فی الکبیر والبیھقی من حدیث ابن عمر وقدروی مرفوعًا وموقوفًا۔

ہوسکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ ”کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگرچہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو“(۱)، ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے اور جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے(۲)، یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ ”منافق کی علامتیں تین ہیں، جب کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے“ (۳)، صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے، ”اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو“ (۴)۔

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہوجاتا ہے اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے“ (۵)۔

---

(۱) مسند احمد عن ابی ہریرۃؓ ج ۲ ص ۳۵۲ و ۳۶۴ و طبرانی، نیز مسند ابی یعلی عن عمر بن خطابؓ، یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب و ترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق ص ۱۹۲، ۱۹۳ سے لی گئی ہیں۔ (۲) صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامۃ المنافق ج ۱ ص ۱۰ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال المنافق ج ۱ ص ۴۲ و ابوداؤد کتاب السنۃ باب الدلیل علی الزیادۃ والنقصان ج ۲ ص ۶۴۴ و ترمذی ابواب الایمان باب ماجاء فی علامۃ المنافق ج ۲ ص ۹۱ و نسائی کتاب الایمان و شرائعہ باب علامۃ المنافق ج ۲ ص ۲۳۲ (۳) صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامۃ المنافق ج ۱ ص ۱۰ و کتاب الادب باب قول اللہ اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین ج ۲ ص ۹۰۰ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب خصال المنافق ص ۴۳ (۴) صحیح مسلم حوالہ سابق (۵) صحیح بخاری کتاب الادب باب قول اللہ اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین ج ۲ ص ۹۰۰۔

دل کی سچائی: صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لئے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر آپ ﷺ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپ ﷺ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی، لیکن چوں کہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ. اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

(منفقون: ۶۳-۱)

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں، زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہیں، لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں، ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے، جس کی برائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ "قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جاں بازی کے کارنامے بیان کرے گا، لیکن ان کارناموں کو سن کر خدا کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے" (۱)، یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہیں کئے گئے تھے، تاہم چوں کہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کئے گئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا کہ ان کے کارناموں کی حقیقی غرض خدا کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا خدا کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچائی: عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو یا یوں کہیے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلاً ایک شخص نماز میں خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے، لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے، ایک شخص نمائش کے لئے ایسا نہیں کرتا، تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع و خضوع ظاہر ہوتا ہے اس کے باطن میں وہ خشوع و خضوع نہیں ہے، اس لئے اس کے

(۱) ترمذی ابواب الزهد باب ماجاء فی الریا والسمعة ج۲ ص۶۳۔

ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں، اس لئے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لئے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ میں جان ومال سے جہاد کیا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، خدا نے فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ. (حجرات:۴۹-۱۵)	مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک (وشبہ) نہیں کیا اور اللہ کے رستے میں اپنی جان ومال سے جہاد کیا، یہی سچے لوگ ہیں۔

یہ سچے اس لئے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کر دی۔

اس صدق عملی کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اس میں کسی قسم کا ضعف وتردد نہ پیدا ہو، مثلاً ایک شخص احکامِ الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے، اس لئے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے، جو مومن کامل ہو، منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے، کیوں کہ عدمِ یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِیْهَا الْقِتَالُ رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یَّنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ. طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ. (محمد:۴۷-۲۰و۲۱)	اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو، پھر جب کوئی سورہ اترتی ہے اور اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو، تو ان پر تف ہو، (رسول کی) فرماں برداری چاہئے اور صاف وصحیح جواب دینا چاہئے، اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول وقرار کیا جائے اور جس قول وقرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے، اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے، کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کر لے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو، لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو، اس لئے صحابۂ کرامؓ میں جن لوگوں نے عزمِ صادق کے ساتھ اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے خدا نے ان کو سچا کہا ہے۔

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس کی تلافی کے لئے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جاں بازی کے جوہر دکھاؤں گا، چنانچہ اس کے بعد غزوۂ احد میں شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی (۱):

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا. لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا.

(احزاب:۳۳-۲۳و۲۴)

مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے ساتھ انہوں نے (جاں نثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے، سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت کے) منتظر ہیں، اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی تو ردو بدل نہیں کیا، تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے، اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے، یا ان کو معاف کرے (۲) بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

صدقِ عملی کی سب سے اعلا قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر ارادہ، اور عمل کی ہر جنبش حق وصداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس

(۱) بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورہ احزاب باب قوله فمنهم من قضى نحبه الخ ج۲ ص۷۰۵ (۲) یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو، اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرمادے۔

کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ''میں خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں'' آپ ﷺ نے کہا سوچ سمجھ کر کہو کیوں کہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے ''میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لئے رات کو جاگا کرتا ہوں، (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرشِ الٰہی کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہلِ جنت باہم مل جل رہے ہیں، گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں'' ارشاد ہوا کہ ''تم نے جان لیا، اسی پر قائم رہو'' (۱)۔

صحابۂ کرامؓ ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خاص صحبتوں میں ان کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت حنظلہ اسیدیؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گذرے انہوں نے پوچھا حنظلہ کیا بات ہے؟ بولے میں منافق ہوگیا، ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ ﷺ جنت دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم ان کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں، لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دنیوی کاروبار میں مشغول ہوجاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونوں بزرگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے، یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے (۲)۔

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، فرمایا:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ. (تکاثر:۱۰۲-۵)	ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہوسکتے۔

سچائی کی اسی اعلاترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ	نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف
وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	کرلو، بلکہ نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت اور
الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ	فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے،
عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	اور مال اللہ کی حب پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ	اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور (غلامی وغیرہ کی قید

(۱) اسد الغابہ تذکرہ حارث بن مالک ج ۱ ص ۳۴۶ (۲) ترمذی ابواب الزہد، ابواب صفۃ القیامۃ بابٌ ج ۲ ص ۷۸۔

الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۷۷)

سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے رہے اور جب (کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے، یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیزگار۔

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے، ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں، اول ان کے ایمان کا کمال، دوسرے ان کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں ان کا ہر طرح پورا اترنا، اور جو لوگ علم اور عمل کے ان تمام فضائل کے درجۂ کمال کو پہنچ جاتے ہیں ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا صدیق کہتے ہیں (۱)، جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبۂ کمال ہے، چنانچہ آیتِ ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہم رہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا. (نساء:۴-۶۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کئے، یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

سورۂ حدید میں ایمانِ کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ (حدید:۵۷-۱۹)

اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہوسکتا، یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ "انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے۔

---

(۱) الصدیق الذی یصدق قوله بالعمل

صدیق وہ ہے، جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔ (مجمع البحار فتنی ج ۳ ص ۳۰۴ دائرۃ المعارف ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء)

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہوتو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

☆

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے، سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کردینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کئے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لئے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لئے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں، جن کے امتیاز کے لئے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (بقرہ:۲-۳) اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

بعض اہلِ تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں (۱)، بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی کہ کیا دی گئی، پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی، خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے، اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہئے جس کو یہ نہیں ملا یا ضرورت سے کم ملا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس

(۱) تفسیر ابن جریر طبری جلد اول ص ۸۰ تفسیر آیت مذکور۔

سے محروم رہے ہیں یا جو اس کے محتاج ہیں، متقیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حثییت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الٰہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہم دردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا، اسی لئے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتا (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا:

يٰٓـاَيُّهَاالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ. (بقرہ:۲-۲۵۴)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اس میں سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خریدنا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش ہے اور کافر ہی ہیں ظالم۔

اس آیتِ پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے، اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روز جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے خدا کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے یا یہ کہ وہ کافرِ نعمت ہے، جو خدا کی روزی کی نعمت پا کر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پرتاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید وفروخت سے حاصل ہوسکتا ہے، نہ دوستی ومحبت سے اور نہ سعی وسفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے خرچ کر کے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے۔

خدا کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اس میں خلوصِ نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو

کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو، اور نہ اس کا اولا ہنا دینا ہو، خود رسول ﷺ کو فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر:۷۴-۶) اور احسان نہ کر (یا احسان نہ دھر) کہ (زیادہ بدلہ چاہے) اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری خدا دے گا اور قیامت کے غم وملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا، ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. (بقرہ:۲-۲۶۲)

جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کے خرچ کئے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ الاہنا دیتے ہیں، ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بہ جائے نفس کی دنائت ظاہر ہوتی ہے، فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ (بقرہ:۲-۲۶۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے، اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو، حالاں کہ تم اب اس کو لینے والے نہیں، مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو اس کا دینا بھی پسند کرو، جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آسکتا، صاف فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ.

(آل عمران:۳-۹۲)

ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے اور جو بھی تم خرچ کرو خدا جانتا ہے۔

یعنی خدا دل کے حال سے خبردار ہے، کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے، مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے اور اسی لئے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے اور اس طرح نیکی کے کام میں جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا، دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد

اورمحتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا، فرمایا:

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ. (بقرہ:۲-۲۷۲)	اور جو بھی تم خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لئے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لئے اور جو بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔

اور اسی لئے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً (بقرہ:۲-۲۴۵)	کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے۔
مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ. (حدید:۵۷-۱۱)	کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو وہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے، اور ہے اس کے لئے عزت کی مزدوری۔

آگے چل کر پھر فرمایا:

إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ. (حدید:۵۷-۱۸)	بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لئے عزت والی مزدوری ہے۔

کہیں حکم کی صورت میں ہے:

وَأَقْرِضُوا اللهَ قَرْضًا حَسَنًا (مزمل:۷۳-۲۰)	اور اللہ کو اچھا قرض دو۔

قرضِ حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لئے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے، ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے:

وَأَقْرَضْتُمُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا (مائدہ:۵-۱۲)	اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔

توان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا:

لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (مائدہ:۵-۱۲)

تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے اور خوش نیتی کے ساتھ کارِ خیر میں خرچ کرتے تھے، خدا نے ان کی تعریف فرمائی:

وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ (توبہ:۹-۹۹)

اور بعضے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں، اللہ سے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔

خدا نے ایسے سخی داتاؤں کو خوش خبری دی:

اَلَاۤ اِنَّهَا قُرۡبَةٌ لَّهُمۡ سَيُدۡخِلُهُمُ اللّٰهُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ. (توبہ:۹-۹۹)

ہاں وہ ان کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے، ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

متقی سخیوں کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے:

وَسَارِعُوۡۤا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ. اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ (آل عمران:۳-۱۳۳و۱۳۴)

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین، تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ میں کیا جائے، ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گونا کیوں کر ہوگا، دور ہو جاتا ہے، فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ. (بقرہ:۲-۲۶۱)

ان کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانہ کی سی ہے، جس سے سات بالیں اگتی ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ کشایش والا ہے، سب جانتا ہے۔

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کرلیتا ہے، خدا گنجایش اور کشایش والا ہے، اس کے ہاں ایک کا سو بن جانا کچھ مشکل نہیں ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے، اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی جو خدا کی خوش نودی کے لئے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں ایک اور مثال دی ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. (بقرہ:۲-۲۶۵)	اور ان کی مثال جو اپنا مال خدا کی خوش نودی چاہنے کے لئے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں، ایک باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا دیا، اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

اس مثال میں ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے، ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ میں جو دیا جائے وہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے، اس لئے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورہ واللیل میں بیان کیا گیا ہے، فرمایا:

(۱) فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى . وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى . فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى. (لیل:۹۲-۵تا۷)	تو جس نے (راہ خدا میں) دیا اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا تو ہم اس کے لئے (نیکی کی) سہج بات کا راستہ آسان کردیں گے۔
(۲) وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى . الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى . وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى . اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى . وَلَسَوْفَ يَرْضٰى. (لیل:۹۲-۱۷تا۲۱)	اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا، جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں، جس کا بدلہ دیا جائے، بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لئے اور وہ خوش ہو جائے گا۔

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا میں دینے کی عادت، اطاعت و عبادت یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کردیتی ہے، جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے، یہ اس نیک عادت کا کتنا

بڑا فائدہ ہے، دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو داد ودہش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس جود وسخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو، بلکہ مقصود صرف خدا ہو اور یہ ہو کہ مال ودولت کے میل سے اس کا دامنِ دل پاک ہو جائے تو خدا فرماتا ہے تو خدا بھی اس کے اس نیک عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا، اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیز گی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال ودولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا، اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لئے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا اور جود وسخا اور داد ودہش کی برملا تعریف اور جمعِ مال، حرص وطمع اور بخل کی بہت مذمت کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیرووں کے دلوں سے مال ودولت کی محبت ہمیشہ کے لئے جاتی رہے:

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ ۔ نِالَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ۔ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہٗ ۔ (ھمزہ:۱۰۴-۱تا۳)	پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے:

وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (الفجر:۸۹-۲۰)	اور تم مال ودولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔

یہی محبت، سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ج وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (بقرہ:۲-۲۶۸)	شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے اور خدا تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشایش اور فضل وکرم کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ کشایش والا ہے، جانتا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں دین ودنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال ودولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ:۲-۲۶۹)

وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے، اس کا سراسر دھوکا ہے اور خدا کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل وکرم کا دروازہ کھلے گا، درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال ودولت کی محبت ایک آزمائش ہے، اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیوں کہ ہر اونچے مقصد کے لئے پہلی شرط جان ومال کی بازی لگانا ہے جس کے پاؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ. فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ.

(تغابن:۶۴-۱۵تا۱۷)

تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے تو اللہ سے ڈرو جتنا ہو سکے اور (اس کی باتوں کو) سنو اور مانو اور (راہِ خدا میں) خرچ کرو، اپنی بھلائی کے لئے اور جو اپنی جان کی لالچ سے بچایا گیا، وہی کامیاب ہیں، اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض تو وہ اس کو تمہارے لئے دونا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔

ان آیتوں میں انفاق اور کارِ خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بہ حرف مطابق ہے، قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی اور افراد میں بانٹتی رہیں، یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے

محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی اور تمول کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بے ہودہ خطرے ہیں:

۱- میری چیز ہے، میں دوسروں کو کیوں دوں۔

۲- دوسروں کو دوں گا تو میرے کمی ہو جائے گی، جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اس نے یہ بتایا اور اپنے پیروؤں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں، وہ صرف خدا کا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہئے:

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (حدید:۵۷-۱۰)	اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

بخل کی برائی میں کہا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (آل عمران:۳-۱۸۰)	اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے، قیامت کے دن ان کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا جس کا بخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے:

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (لقمان ۳۱:۲۵)	اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے:

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الحدید ۵۷:۲)	آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اسی کی ہے۔

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں، تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں، اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی

اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہوگا تردید کی، فرمایا:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ.

(منافقون: ۶۳-۷)

وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو، تا کہ (۱) وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی ﷺ کی کل چل رہی ہے، ان کے بل بوتے سے ہے، خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا:

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ.

(شوریٰ: ۴۲-۱۲)

اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں، پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لئے چاہے اور ناپ دیتا ہے، وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں، اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار اور جذبۂ شکر کا امتحان ہے تو دوسرے میں انسان کی قناعت پسندی، بے طمعی، اور جذبۂ صبر کی آزمائش ہے، فرمایا:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ. وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ. كَلَّا

(فجر: ۸۹-۱۵ تا ۱۷)

سو آدمی جو ہے جب اس کا مالک اس کو جانچے پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی اور جب اس کو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں۔

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونوں خدا کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں، دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھ ہی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی، یا مجھ ہی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ

(۱) (یا) یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آرہی ہے، مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لئے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے:

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلٰى عِلْمٍ ۚ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ. فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۚ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هٰٓؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ. أَوَلَمْ يَعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ.

(زمر:۳۹-۴۹تا۵۲)

سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آ لگے، تو ہم کو پکارے پھر جب ہم اپنی طرف سے اس کو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ یہ تو مجھے علم (۱) پر ملا ہے، (خدا فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے، یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی (۲)، توان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی اور جو کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں اور جو ان میں سے گنہ گار ہیں ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی ہیں، وہ تھکا نہیں سکتے، کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے لئے چاہتا ہے پھیلاتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے، اس میں ایمان والوں کے لئے البتہ نشانیاں ہیں۔

ہر جان دار کی روزی خدا کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آجائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اس کے لئے آسان ہو جائے، اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، خدا نے فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ.

(ھود:۱۱-۶)

اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں، مگر یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے، وہ جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو سونپا جاتا ہے، (یعنی قبر) سب (علم الٰہی کی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔

---

(۱) اس کا ایک مطلب تو اہلِ تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا، دوسرا یہ ہے کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا ہنر مجھے معلوم تھا، اس دوسرے مطلب کی تائید سورہ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے (دیکھو روح المعانی ج۲۴ص۱۱مصر) (۲) چنانچہ قارون کو جب راہِ خدا میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا:

قَالَ إِنَّمَآ أُوتِيتُهُ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِي

(قصص:۲۸-۷۸)

قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے۔

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے وہ تقدیر میں اسی کا حصہ تھا، اس لئے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں، اسلام نے اپنے پیرووں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لئے ان یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے، خدا تعالیٰ پوچھتا ہے:

وَمَنْ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ۚ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ (نمل:۲۷-۶۴)

اور تم کو کون روزی دیتا ہے، آسمان سے اور زمین سے، اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے۔

روزی دینا اسی کا کام ہے:

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ۔ (ذاریات:۵۱-۵۸)

بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زورآور، مضبوط۔

احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے طرح طرح کے پر اثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے، فرمایا "تم باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا(۱)"، یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو نہ دو گے تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کر لے گا اور تم کو نہیں دے گا، ایک دفعہ صحابہؓ سے پوچھا "تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟" لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے"، فرمایا "تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے(۲)"، ایک دفعہ آپ ﷺ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ (تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا) پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال، اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا، یا کھالیا تو اس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا(۳)۔

فرمایا "اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ برابر سونا ہو، اور تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں،

(۱) صحیح مسلم کتاب الزکوۃ باب الحث علی الانفاق الخ ج ۱ص ۳۸۰ (۲) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب ما قدم من مالہ فهو لہ ج ۲ص ۹۵۳ (۳) جامع ترمذی ابواب الزهد باب ماجاء فی الزهادة فی الدنيا حدیث حسن صحیح ج ۲ص ۶۰ و صحیح مسلم اوائل کتاب الزهد ج ۲ص ۵۲۵۔

میں کہوں گا کہ اس کو خدا کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو''، پھر فرمایا''ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو''(۱)۔

فرمایا''رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے، تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے، تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے''(۲)۔

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اسراف اور فضول خرچی ہے، جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے اور جب موت سامنے آ کر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں، قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نقشہ کس پر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (منافقون:۶۳-۱۰)	اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے، تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا۔

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا:

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (منافقون:۶۳-۱۱)	اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اس کا وقت آ جائے اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی ﷺ ما احب ان لی مثل احد ذهبا ج۲ص۹۵۴ (۲) صحیح بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمة ج۱ص۱۷۔

اس لئے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہئے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے، فرمایا ''یہ کہ تم صدقہ کرو اور تم تن درست ہو، مال کی خواہش ہو اور جینے کی بھی امید ہو اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو اور فلاں کو اتنا دو، حالاں کہ وہ تو اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا'' (۱)۔

فرمایا ''اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لئے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لئے برا ہے'' (۲)۔

☆

(۱) صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۸۱ مصر کتاب الزکوٰۃ باب بیان ان افضل الصدقۃ الخ (۲) ایضاً باب بیان ان الید العلیا الخ۔

عفت و پاک بازی

عفت و پاک بازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لئے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں، چنانچہ سورہ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ. فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ. (مومنون:۲۳-۵تا۷)	اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرم گاہوں کی پاس بانی کرتے ہیں، مگر اپنی بیبیوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیوں) سے تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کے طلب گار ہوں تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔

سورہ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے ان میں ایک عفت اور پاک بازی بھی ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. (معارج:۷۰-۲۹)	اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے، ان میں وہ بھی ہیں جو عفیف اور پاک دامن ہیں:

وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (احزاب:۳۳-۳۵)	اور اپنی شرم گاہوں کی پاس بانی کرنے والے مرد اور پاس بانی کرنے والی عورتیں۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاک دامنی کے لئے قرآن کی اصطلاح "حفظِ فروج" ہے، حفظ کے معنیٰ حفاظت اور پاس بانی کے ہیں اور فروج اپنے معنیٰ میں ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہیں، جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لئے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے، فروج کے اصلی معنیٰ

دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اسی لئے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو، اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضا میں سے اس خلا کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے، اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاس بانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریقۂ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاک بازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاک بازی کے لئے قرآن کا دوسرا لفظ احصان ہے، جو حصن سے بنا ہے، جس کے معنیٰ قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں، اس سے حصان، احصان، محصن، اور محصن، الفاظ بنائے گئے ہیں، پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا، مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے، اس کے معنیٰ پاک دامن عورت کے ہیں، دوسرے کے معنیٰ حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں، یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت و پاک دامنی کے بیان میں ماضی معروف کے صیغہ میں:

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِىٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا — اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

(تحریم: ۶۶-۱۲)

وَالَّتِىٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا — اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

(انبیاء: ۲۱-۹۱)

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا، لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آ کر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے، فرمایا:

فَاِذَآ اُحْصِنَّ (نساء: ۴-۲۵) — تو جب وہ نکاح کی قید میں آ چکیں۔

اسی سے اس کا اسم فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے:

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (نساء: ۴-۲۴) — حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ (نساء: ۴-۲۵) — حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے، صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں، اسی لئے قرآن پاک میں اس کے علاوہ محصنتٌ (حفاظت

میں رکھی ہوئی بی بیاں) دو معنوں میں آیا ہے، ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں جیسے:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (نساء:۴-۲۴) اور بیاہی عورتیں (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)

دوسرے شریف آزاد بیویوں کے معنی میں، جیسے:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (نساء:۴-۲۵) اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)۔

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے:

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (نساء:۴-۳۴) پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاک بازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت ورسالت کا لازمی جز ہے، نبی، نبی کے سلسلۂ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے، حضرت عیسیٰؑ کی ماں حضرت مریم علیہا السلام کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاک دامنی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی:

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (تحریم:۶۶-۱۲) اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (انبیاء:۲۱-۹۱) اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

حضرت یوسفؑ نے جس پاک بازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی:

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ (یوسف:۱۲-۳۲) اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔

خدا نے فرمایا میں نے ایسا اس لئے کیا:

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف:۱۲-۲۴) تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں، وہ بے شبہ ہمارے چنے بندوں میں تھا۔

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں۔

حضرت یحییٰؑ کی تعریف میں فرمایا گیا:

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ. (آل عمران:۳-۳۹)
اور سردار ہوگا اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔

اسلام میں اہل بیت نبوی ﷺ کی زندگی جس عفت، عصمت اور پاک بازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی:

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ. (نور:۲۴-۲۶)
یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں، ان کے لئے بخشائش ہے، اور عزت والی روزی۔

عفت و پاک دامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فَاحِشَةٌ (۱) آیا ہے، جس کے معنیٰ بہت بڑی برائی کے ہیں، جیسے:

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (نساء:۴-۱۹)
مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ (نساء:۴-۱۵)
اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا. (بنی اسرائیل:۱۷-۳۲)
اور زنا کے قریب نہ جاؤ بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہیں فرمایا کہ تم زنا نہ کرنا، بلکہ یہ کہا کہ تم زنا کے قریب نہ جانا، اس طرزِ ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعلِ بد ہی سے بچنے کی تاکید کی بلکہ اس سے قریب ہو کر گذرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے، اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے، کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی میں ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریفانہ

(۱) اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے، بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

حرکات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لئے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں، حرام قرار دیا، مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے، مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ. (نور:۲۴-۳۰)

اے پیغمبر! ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں، اور اپنے ستر کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے بڑی ستھری بات ہے، اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

عورتوں کی ذرا سی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لئے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئیں، مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں اسی لئے زمین پر ہولے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوش بو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلیں، مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھیں، کسی غیر عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتیں درحقیقت لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہیں، فرمایا:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ

اور اے پیغمبر ایمان والی بی بیوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں، مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے (۱) اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں اور اپنا سنگار نہ کھولیں، مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے یا اپنے شوہر کے باپ یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں (۲) یا

---

(۱) جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی یا انگلیوں کی انگوٹھی، اسی لئے چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔ (۲) یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے۔ (روح المعانی جزء ثامن عشر ص ۱۲۹)۔

الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (نور:۲۴-۳۱)	اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں اس کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانو! خدا کے آگے توبہ کرو شاید تم بھلائی پاؤ۔

اور حسب ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتوں کے لئے اس میں پیروی کا نمونہ ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا. وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ (۲) الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (احزاب:۳۳-۳۲و۳۳)	اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت، اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو، سو تم دب کر (مرد سے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ خواہش کرے (۱) اور نیک بات کہو اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کے پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ...... الآية (احزاب:۳۳-۵۳)	اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدون کہ تم کو اجازت دی جائے، (کھانے کی دعوت کے لئے) داخل نہ ہو۔

گو یہ حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی ﷺ کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ عفت و پاک دامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ. (نور:۲۴-۲۷)	اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو، جب تک خبر نہ کرلو اور ان گھر والوں کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں شاید تم یاد رکھو۔

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہیں کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے، چنانچہ کاشانۂ نبوی کے تعلق سے حکم ہوتا ہے:

(۱) یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو۔ (۲) التبرج اظهار الزينة للناس الاجانب (لسان العرب ج ا ص ۱۸۵)

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ (احزاب:۳۳-۵۳)

اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کے اوٹ سے، اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کی بڑی ستھرائی ہے۔

یہ حکم گو شانِ نزول کے لحاظ سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے سلسلہ سے ہے، مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لئے بھی حسنِ ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں تاکہ ان کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیاں ہیں، ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا. (احزاب:۳۳-۵۹و۶۰)

اے نبی! اپنی بیویوں، اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں نیچی لٹکالیں، اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکے تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے، پھر وہ نہ رہنے پائیں گے، اس شہر میں تیرے ساتھ، مگر تھوڑے دن۔

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے، جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں، چھیڑتے تھے اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھتے تھے، اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دئے، شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہیں کافی سزا دی جائے، بلکہ ان کو شہر بدر کیا جاسکتا ہے اور مسلمان بی بیوں کے لئے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں، اس کے لئے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں، جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ

جائیں اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بی بیاں ہیں، جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا(۱) اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے، مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے، عورتیں بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں، سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں، بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے(۲) اور نشان کے لئے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں، اسلام نے آکر ان مراسم کی اصلاح کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاک بازی کے خیالات پھیلانے کے لئے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری:

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُكْرِهْهُنَّ فَإِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ. (نور:۲۴-۳۳)	اور تمہاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لئے زبردستی بدکاری نہ کرایا کرو اور جو ان کو اس پر مجبور کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

اسی لئے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے(۳)، اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لئے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے، کیوں کہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی، سنن ابی داؤد(۴) میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا اور رسول اللہ ﷺ سے اس

(۱) تفسیر طبری تفسیر سورہ نور ج ۱۸ ص ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد عن جابر کتاب الطلاق باب فی تعظیم الزنا ج ۱ ص ۳۱۶ (۲) سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدہ کا یہ شعر پڑھے

رحيب قطاب الجيب منها رقيقة ☆ بجس الندامیٰ بضة المتجرد

(شرح المعلقات السبع مطبع دار الکتب العربیہ مصر ص ۵۸)

(۳) صحیح مسلم کتاب البیوع باب تحریم مطل الغنی وغیرہ ج ۱ ص ۶۲۵ (۴) کتاب النکاح باب فی قوله الزانی لاینکح...... الخ، ج ۱ ص ۲۸۰۔

کی اجازت چاہی، وحیِ الٰہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا:

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (نور:۲۴-۳)

بدکار مرد بدکار ہی عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے گا اور بدکار عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گا، ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آسکتا ہے، اسی لئے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ (نور:۲۴-۲۶)

گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے۔

اسی لئے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاک باز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں، بلکہ بعض علما کے نزدیک سرے سے جائز نہیں (۱) اور ان کی دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث سے ہے، جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے، ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح

(۱) جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے، یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے، لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بہ ظاہر سمجھی جاتی ہے اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہلِ ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا اَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ (نور:۲۴-۳۲) اور فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (نساء:۴-۳) سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے، لیکن بعض صحابہؓ اور علما کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے، بلکہ اگر زن و شو میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا (روح المعانی ج ۱۸ ص ۷۹) ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے (کتاب النکاح باب فی قولہ الزانی لاینکح الا زانیۃ ج ۱ ص ۲۸۰) بعض فقہا نے بھی یہ کہا ہے کہ زن و شو میں کفو ہونا شرط ہے اور چوں کہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو، توبہ کرنے کے بعد جائز ہے، (دیکھو احکام القرآن جصاص رازی ج ۳ ص ۲۶۵، ۲۶۶ ترکی ۱۳۳۵ھ) و تفسیرات احمدیہ ملاجیون و تفسیر کبیر رازی ج ۶ ص ۳۲۸ و بعد بہامشہ تفسیر ابی سعود و روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ ج ۱۸ ص ۷۶ تا ۷۹)۔

ایسے ہی سے کیا جائے (۱)۔

غرض اہلِ ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاک بازی ہے، ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہیے، چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں: جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے اور جو بدکاری نہیں کرتے، فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ	اور جو خدائے برحق کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے،
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ	اور کسی ایسی جان کا جس کو خدا نے منع کیا ہے، خون نہیں
(فرقان: ۲۵-۶۸)	بہاتے، اور بدکاری نہیں کرتے۔

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے جس کا انکار سراسر کفر ہے، اس کے بعد جو دو باتیں ہیں ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں جن کا بیان اوپر آیا ہے اور جو حقیقت میں لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى (بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحیں ہیں، ان کی مزید تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے ایک صحابیؓ کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں (۲)، حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ اے اسماءؓ جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں (۳)، حکم دیا کہ مخنث زنان خانوں میں نہ جانے پائیں (۴)، فرمایا کہ کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس سے اس کے اہل خانہ کی بے ستری ہو (۵)، فرمایا کہ ''عورت تیز خوش بو

۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب فی قولہ الزانی لاینکح الازانیۃ ج ۱ص ۲۸۰ (۲) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی نظرۃ الفجاءۃ (۳) ابوداؤد کتاب اللباس باب فیما تبدی المراۃ من زینتھا ج ۲ص ۵۶۷ (۴) ابوداؤد کتاب الادب باب الحکم فی المخنثین ج ۲ص ۶۷۴ (۵) ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت ج ۲ص ۱۰۰۔

لگا کر باہر نکلے"(۱) سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوش بو پاس سے گذرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ "عورت بیچ راہ سے الگ ہوکر کنارہ کنارہ چلے"(۲) تا کہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے (۳) کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس گیا تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے (۴)۔

یہ ساری ہدایتیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاک دامنی کی تصویر ہو۔

لیکن صرف ان ہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ ان کے لئے جو سوسائٹی کی عزت وحرمت کو خطرہ میں ڈالیں شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی تا کہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے:

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ (نور:۲۴-۲)

بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

احادیث میں بیاہے مردوں اور عورتوں (۵) میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگ سار کرنے کا بھی حکم ہے، اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے، اس لئے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے ان میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کریں گی، فرمایا:

وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَاَرْجُلِھِنَّ (ممتحنہ:۶۰-۱۲)

اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الترجل باب فی طیب المرأۃ للخروج ج۲ص۵۷۵ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق ج۲ص۷۱۴ (۳) مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والدخول علیھا ج۲ص۲۴۱،۲۴۲ (۴) ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت ج۲ص۱۱۰ (۵) یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی۔

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے، لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی، حالاں کہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو(۱)، یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے، جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے، بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں، یہ ساری باتیں عفت اور پاک دامنی کے خلاف تھیں، اس لئے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، فتح مکہ کے وقت آپ ﷺ نے قریشی بیویوں (۲) سے اور مدینہ میں انصاری خاتونوں سے بھی اس پر عہد لیا (۳)، بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا اور صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے ان پر بیعت کی (۴)۔

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے، اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسّی کوڑے مارے جائیں گے اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے، ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے(۵)۔

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے، اور حقوقِ عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاک بازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔

---

(۱) مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گزرا ہے ج ۲۸ ص ۰۷ (۲) صحیح بخاری کتاب المغازی فتح مکہ (اس روایت کی تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن غزوۃ الحدیبیہ کی ایک روایت سے یہ بات ثابت ہے ج ۲ ص ۶۰۱ ''ض'') (۳) صحیح بخاری کتاب الجهاد باب حمل النساء و القراب الخ ج ۱ ص ۴۰۳ و تفسیر طبری جزء ثامن وعشرون تفسیر سورہ ممتحنہ ص ۴۹ (۴) صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوة الایمان ج ۱ ص ۷ (۵) اس کی تفصیل سورہ نور میں ہے، اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں، مگر شروع سے عمل درآمد اسی پر رہا ہے، بخاری باب اللعان۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسول! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا: یہ کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ، حالاں کہ اس نے تم کو پیدا کیا، بولے، اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا، بولے اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لئے یہ آیت نازل فرمائی (۱):

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ	اور جو خدا کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکاریں
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ	اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس کو
(فرقان:۲۵-۶۸)	خدا نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا کے مرتکب ہوں۔

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوس ناک ہیں کہ جن سے یہ امید نہیں ہو سکتی ان سے یہ فعل ظہور میں آیا اور انسانی اعتماد واعتبار کو صدمہ پہنچا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے، اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے، تو مسلمان نہیں رہتا'' (۲)، کیوں کہ ایمان نام یقین کا ہے اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھ کر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا، اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو کوڑے مارنا، اور بعض حالتوں میں سنگ سار کرنا ہے، لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب میں رسول اللہ ﷺ کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی گئیں، ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعلِ قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی

(۱) بخاری کتاب الادب باب قتل الولد خشیة ان یاکل معه ج۲ص۸۸۷ (۲) بخاری کتاب الحدود باب الزنا وشرب الخمر ج۲ص۱۰۰۱، ۱۰۰۲۔

اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں، جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اندر سے نکل آئیں گے، لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے (۱)، یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بہ خلاف پاک باز اور پاک دامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، خداوند تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں (۲)۔

یہ تو وہ شرف ہے جو پاک بازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا، لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، کہ دفعتاً پانی برسنے لگا، تینوں نے پانی سے بچنے کے لئے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، سوء اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہوگیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کے واسطہ سے خدا سے دعا کریں، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی، اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان میں پاک باز آدمی کی دعا یہ تھی:

> ”خداوندا میرے ایک چچا زاد بہن تھی، جس سے میں بڑی محبت رکھتا تھا، میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی، میں نے سو دینار کما کر جمع کئے اور اس کو دے کر اپنی خواہشِ نفسانی پوری کرنی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ خدا سے ڈرو، میں فوراً رک گیا، خداوندا اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لئے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا لے، چنانچہ وہ سرک گیا (۳)“۔

یہ روایت عفت و پاک بازی کو ان اعمال میں شمار کرتی ہے جن سے خدا کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

---

(۱) بخاری کتاب الجنائز باب ج ۱ ص ۱۸۵ (۲) بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش ج ۲ ص ۱۰۰۵ (۳) بخاری کتاب الادب باب اجابة دعاء من بر والدیہ ج ۲ ص ۸۸۳۔

دیانت داری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانت داری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایمان دار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے، اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے، امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (احزاب:۳۳-۷۲)	ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شبہ وہ ظالم اور نادان ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں، اگر ہم ایسا نہ کریں تو خائن ٹھہریں گے۔

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا تاکہ بندوں کے لئے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لئے قرآن میں اس فرشتہ کا نام ''الامین'' رکھا گیا:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ. (شعراء:۲۶-۱۹۳)	اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔
مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ. (تکویر:۸۱-۲۱)	اس کا کہا مانا جاتا ہے، وہاں امانت والا ہے۔

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا:

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ. (شعراء:۲۶-۱۷۸)	میں تمہارے لئے امانت دار قاصد ہوں۔

یعنی خدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے، وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہوں، اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔

ہمارے رسول اکرم ﷺ کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے ''امین'' کا خطاب ملا تھا، کیوں کہ آپ ﷺ اپنے کاروبار میں دیانت دار تھے، اور جو لوگ جو کچھ آپ ﷺ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ ﷺ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی:

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ.	اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

(مومنون:۲۳-۸)

بعضے روایتوں میں ہے کہ خانۂ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبد الدار شیبی کے پاس رہتی تھی، فتح مکہ کے وقت وہ ان کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی، اس پر یہ آیت اتری:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا	بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔

(نساء:۴-۵۸)

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی، انہوں نے سبب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم دیا ہے، وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے (۱)، بہر حال یہ واقعہ صرف شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا، اسی لئے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیفِ شرعی ہے (۲) اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے (۳) اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں، جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیا تک محدود نہیں، جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ہر مالی، قانونی، اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے، کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں

(۱) تفسیر کشاف زمخشری ج ۱ ص ۲۹۷ مطبع لیسی کلکتہ ۱۸۵۶ء (۲) ایضاً (۳) تفسیر ابن جریر طبری ج ۵ ص ۸۶ تفسیر آیت بالا۔

سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے اپنے کسی نج کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرالیتا ہے یا بے سبب سستی کرتا ہے یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے۔

ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے، وہ بھی ہیں:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ. (مومنون:۲۳-۸)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاس بانی کرتے ہیں۔

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں جگہ دی جانے والی ہے ان میں بھی وہ داخل ہیں:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ. (معارج:۷۰-۳۲)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاس بانی کرتے ہیں۔

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی، یا سفر میں گواہ وشاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گرو رکھی:

فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (بقرہ:۲-۲۸۳)

تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہئے کہ اپنی امانت ادا کردے اور چاہئے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

یعنی لے کر مکر نہ جائے یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ ان ہی چیزوں کا نام خیانت ہے، جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے:

وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (انفال:۸-۲۷)

اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لئے پانی بھر دیا اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے

ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجئے تو اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

يَآ اَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ. (قصص: ۲۸-۲۶)

اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجئے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقت ور اور امانت دار ہو۔

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لئے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے اور اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹے سستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دور رس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے، مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے، اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے، امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کے رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے اسی طرح ایک حدیث ادھر بھی اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے راز دار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو باتیں سنی تھیں، ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے (یعنی ان کی فطرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن جانا، کچھ سنت سے سیکھا، (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ پھر آپ ﷺ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا "پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے، لیکن کوئی امانت داری نہیں کرے گا، اس وقت امانت داری کی مثال ایسی کم یاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے، آدمی کی تعریف

ہوگی کہ کیسا عقل مند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالاں کہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی''(۱)۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمان داری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دین داری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں، جس کو عہد کا پاس نہ ہو، اس میں دین نہیں، اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اور اس کی زبان درست نہ ہوگی، جب تک اس کا دل دوست نہ ہوگا...... اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا، بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے(۲)۔

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں''(۳) اور یہ ظاہر ہے کیوں کہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمان داری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آنحضرت ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے''(۴)، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہئے، الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب رفع الامانۃ ج ۲ ص ۹۶۱ و کتاب الفتن باب اذا بقی فی حثالۃ من الناس ج ۲ ص ۱۰۴۹ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب رفع الامانۃ ج ۱ ص ۶۸ و مسند احمد ج ۵ ص ۳۸۳ و ترمذی کتاب الفتن باب رفع الامانۃ ج ۲ ص ۴۱ و ابن ماجہ کتاب الفتن باب ذہاب الامانۃ ج ۲ ص ۳۰۳ (۲) کنز العمال ج ۲ ص ۱۵ حیدرآباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ (۳) کنز العمال ج ۲ ص ۱۱۵ از طبرانی اوسط و طبرانی کبیر و ابن عدی فی الکامل و بیہقی فی شعب الایمان (۴) ادب المفرد بخاری بہامشہ مسند الامام الاعظم ابی حنیفۃ باب المستشار مؤتمن ص ۵۳۔

کے روکنے کا کام لیا جائے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا المجالس بالامانۃ یعنی "نشستیں امانت کے ساتھ ہوں مگر تین موقعوں پر کہیں کسی کے ناحق قتل کی یا کسی کی آبروریزی کی یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو(۱)" تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہئے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے، بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے(۲)، راز کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے(۳)، امانت میں خیانت کرنا آنحضرت ﷺ نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے(۴)۔

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے، حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ "عورتوں کے باب میں خدا سے ڈرو"، فرمایا "کیوں کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت (۵) میں لیا ہے"۔

قیامت کی نشانیوں میں آیا ہے کہ "سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ خدا کے ہاں نہیں" (۶) فرمایا میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ جرمانہ نہیں سمجھے گی (۷)، یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کارِ خیر میں دینے کو جرمانہ جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے، ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

☆

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث ج ۲ ص ۶۶۸ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق ج ۱ ص ۱۰ (۵) صحیح مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی ﷺ ج ۱ ص ۴۶۷ (۶) کنز العمال ج ۳ ص ۱۱۵ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباس (۷) کنز العمال ج ۳ ص ۱۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاک بازی کا دامن اسی کے بہ دولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود خداوند تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے جو اس کی ذاتِ اقدس کے لائق ہیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن ان کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے، اس کو نامراد نہیں لوٹاتا، حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''عزت اور جلال والے خدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے(۱)''، ایک دفعہ تین صاحب مجلس نبوی ﷺ میں آئے، آپ ﷺ کے اردگرد صحابہؓ کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی، اس میں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرے صاحب چلے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آکر بیٹھا وہ خدا کی پناہ میں آیا تو خدا نے پناہ کی جگہ دی اور جو پیچھے جا کر بیٹھا، وہ شرمایا، خدا نے بھی اس سے شرم کی، (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا اس نے خدا سے منہ پھیرا(۲) تو خدا نے بھی اس سے منہ پھیرا۔

سورہ بقرہ میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا — خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔

(بقرہ:۲-۲۶)

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے، وَاللّٰہُ لَا

(۱) بیہقی کتاب الاسماء والصفات باب ماجاء فی الاستحیاء الہ آباد ص ۳۴۰ (۲) بخاری کتاب العلم باب من قعد حیث ینتھی بہ المجلس ج ۱ ص ۱۵ و صحیح مسلم کتاب السلام باب من اتی مجلسا فوجد فرجۃ الخ ج ۲ ص ۲۴۲۔

يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ (احزاب:۳۳-۵۳) ''خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا''، حدیث میں بھی ہے کہ ان اللہ لا یستحیی من الحق (۱) ''اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں''، قرآن اور حدیث کے اس طرزِ ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت خدا کی طرف غیرت وحیا کے خلاف ہے، حدیث میں آتا ہے کہ ''خدا سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لئے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے'' (۲)۔

موسیٰ کو مدین کے سفر میں دولڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا، وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں، تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا، ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلاکر پلٹ نہ جاتے وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ کے بلانے کے لئے بھیجا:

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰهُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ — توان دولڑکیوں میں سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی۔

(قصص:۲۸-۲۵)

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیاوالی لڑکی کی مدح وستایش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہے، اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے، اسی لئے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، ستر عورت کا خیال، نگاہیں نیچی رکھنا، بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا، یہاں تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا اسی لئے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں، اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا۔

آنحضرت ﷺ جب بچہ تھے تو خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام ہورہا تھا، آپ ﷺ اینٹیں اٹھا اٹھا کرلا رہے تھے، آپ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہ بند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق ج۲ص۹۰۴ (۲) صحیح مسلم کتاب التوبۃ باب غیرۃ اللہ الخ ج۲ص۴۴۶، عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے، مگراس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب سے ہوجاتے ہیں، غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں، جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔

کی رگڑنہ لگے، آپ ﷺ نے ایسا کیا تو آپ ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، ہوش آیا تو زبانِ مبارک پر تھا، میرا تہ بند، حضرت عباسؓ نے تہ بند باندھ دیا(۱)، نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ کا یہ حال تھا کہ صحابہؓ کہتے ہیں:

کان النبی ﷺ اشد حیاء من العذراء فی خدرھا (۲) — رسول اللہ ﷺ پردہ نشین کواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔

بعض موقعوں پر آپ ﷺ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے، جیسا کہ سورہ احزاب میں مذکور ہے:

اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ (احزاب:۳۳-۵۳) — تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لئے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم وحیا کی وجہ سے نہیں کرسکتا، بلکہ بعض حالتوں میں اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لئے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جز شامل ہے، شریعتِ مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ امرِ حق کے اظہار میں شرم وحیا دامن گیر نہ ہو، لیکن دوسروں کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کررہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو، کیوں کہ حیا ایمان سے ہے(۳)۔

یہی حیا جو ایمان کا ایک جز ہے شرعی حیا ہے، جس طرح ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام فواحش ومنکرات سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے، اس لئے وہ دونوں ایک ہی ہیں، لیکن جن لوگوں میں فطرتاً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے، ان کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لئے بہ ذات خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں بلکہ اصلاح کے قابل ہے اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہارِ حق، وعظ وپند، تبلیغ ودعوت، امر بالمعروف اور

---

(۱) بخاری کتاب الحج کتاب المناسک باب فضل مکۃ وبنیانھا ج۱ ص۲۱۵ (۲) بخاری کتاب الادب باب الحیاء ج۲ ص۹۰۳ (۳) بخاری کتاب الایمان باب الحیاء من الایمان ج۱ ص۸ و کتاب الادب باب الحیاء ج۲ ص۹۰۳۔

نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً خدا نے قرآن مجید میں جا بہ جا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے خدا نہیں شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا (بقرہ:۲-۲۶)	اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں جھینپتا چاہے وہ مثال (مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر) کسی اور حقیر چیز کی)۔

حضرت زینبؓ کی دعوتِ ولیمہ میں صحابۂ کرامؓ کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، جس سے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم چوں کہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آدابِ نبوت کے خلاف تھا، اس لئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ (احزاب:۳۳-۵۳)	اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے، اور اللہ تو حق (بات کے کہنے) میں (کسی کا کچھ) لحاظ نہیں کرتا۔

اپنی ذاتی تکلیف کے لئے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا، رسول اللہ ﷺ کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لئے آپ ﷺ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا، اس لئے خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیا کا موقع نہیں۔

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابۂ کرامؓ کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہؓ آپ ﷺ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے، تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! خدا حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر

کبھی خزاں نہیں آتی، اکابر صحابہؓ اس درخت کے نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے، تاہم چوں کہ کم سن تھے، اس لئے شرم سے چپ رہے، لیکن چوں کہ یہ شرم وحیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی، اس لئے جب حضرت عمرؓ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتادیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی (۱)۔

انصاریہ عورتیں رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

نعم النسآء نسآء الانصار لم یکن یمنعھن الحیآء ان یتفقھن فی الدین (۲)

انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیا نہیں روکتی تھی۔

ان موقعوں یعنی تبلیغ ودعوت، پندونصیحت، ارشادوہدایت، تعلیم وتعلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الحیاء لا یاتی الا بخیر (۳)

حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیوں کہ یہی جذبۂ حیا ہے جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کرسکتا ہے، کوئی روک نہیں سکتا، اس لئے فرمایا کہ:

ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الاولیٰ اذا لم تستح فاصنع ماشئت (۴)

لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم وحیا نہیں تو جو چاہو کرو۔

امام نووی (۵) نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کرسکتے ہو۔

قرآن وحدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب مالا یستحیی من الحق للتفقہ فی الدین ج۲ص۹۰۴ (۲) مسلم کتاب الطہارۃ (کتاب الحیض) باب استحباب استعمال المغتسلۃ من الحیض فرصۃ من مسک فی موضع الدم ج۱ص۱۳۷ (۳) بخاری کتاب الادب باب الحیاء ج۲ص۹۰۳ (۴) بخاری کتاب الادب باب اذلم تستح فاصنع ماشئت ج۲ص۹۰۴ (۵) فتح الباری ج۱۰ص۴۳۴۔

کے یہی سب کام مراد ہیں اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے، اسی بنا پر حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص خلق حیا ہے (۱)، یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے (۲) فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو، کیوں کہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول وبراز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو (۳)۔

مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

---

(۱) موطا امام مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی الحیاء ص ۳۶۴ (۲) صحیح بخاری کتاب الایمان باب امور الایمان ج ۱ ص ۶ (۳) ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع ج ۲ ص ۱۰۷۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، ان کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگ دلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے، اسی لئے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے وہ رحمان یعنی ''بڑا رحم والا'' ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام رحیم آتا ہے،''یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے، مسلمان کو حکم ہے جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے، دنیا میں جو کچھ ہے وہ خدا کی رحمت کے جلووں کے سوا کچھ اور نہیں، خدا کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں:

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (مومن:۴۰-۷) اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے۔

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے بلکہ:

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ. (حشر:۵۹-۲۲) وہی رحم والا مہربان ہے۔

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں:

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ. (مومنون:۲۳-۱۱۸) اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

دنیا میں رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں، وہ اسی کی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کئے، جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لئے، اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں، یہاں

تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے“(۱)۔

بنی نوع انسان میں محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ واشرف ہستی رسول اللہ ﷺ کی ہے اور خداوند تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے:

لَقَدْ جَآئَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ	(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں کے ایک رسول آئے ہیں،
مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ	تمہاری تکلیف ان پر شاق گذرتی ہے، (اور) ان کو تمہاری
رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ. (توبہ:۹-۱۲۸)	بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں۔

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں اور ان امتوں میں سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے:

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً	اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے
(حدید:۵۷-۲۷)	ترس اور رحم ڈال دیا۔

اور اس وصف میں امتِ محمدیہ بھی ان کی شریک وسہیم ہے:

وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ	اور جو لوگ محمد کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر زورآور ہیں،
(فتح:۴۸-۲۹)	آپس میں رحم دل ہیں۔

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلۂ رحم کہتے ہیں، کیوں کہ قرابتوں کے سارے رشتے رحمِ مادری سے پیدا ہوتے ہیں اور رِحم رَحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے، اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

الرحم شجنة من الرحمن (۲)	رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔

یعنی قرابت کی رحم دلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں، بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہؓ بن زید فرماتے ہیں، کہ ”رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے، پھر

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب ج۲ص۸۸۷ (۲) بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ ج۲ص۸۸۵۔

دونوں زانو کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونوں پر رحم کر کیوں کہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں'' (۱)۔

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس کو لپٹانے لگا، آپ ﷺ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا ''تم اس پر رحم کرتے ہو؟''، اس نے کہا ''ہاں'' ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (۲)۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا، آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا'' (۳)۔

ایک اور بدو نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں، لیکن ہم لوگ نہیں چومتے، ارشاد ہوا کہ ''خدا نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے'' (۴)۔

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا امتِ محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اس لئے فرمایا کہ ''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے'' (۵)، اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیر دستوں پر کھایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔

خود اپنی قوم کی ہم دردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے صحابۂ کرامؓ کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے ''رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ'' یعنی وہ لوگ آپس میں رحم دل ہیں اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحم دلی، باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے (۶)، جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبۂ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں اور

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الفخذ ج۲ص۸۸۸ (۲) ادب المفرد باب رحمة العیال ص۷۵ (۳) بخاری کتاب الادب باب رحمة الولد وتقبیله ومعانقته ج۲ص۸۸۷ (۴) ایضاً (۵) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی رحمة الصبیان ج۲ص۴۳۹ (۶) بخاری کتاب الادب باب رحمة الناس والبھائم ج۲ص۸۸۹۔

انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضا اور جوارح ہیں، اس لئے جس طرح ایک عضو کے درد دکھ میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے درد دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہئے۔

اسلام نے جس رحم دلی کی تعلیم دی ہے، وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے کہ جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا خدا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا، یہ بھی فرمایا کہ ''رحم کرنے والوں پر رحم کرنے والا خدا رحم کرے گا، زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا'' (۱)۔

رحم دلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا'' (۲)، ایک شخص نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں، تو مجھے اس پر ترس آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، آپ ﷺ نے دوبار فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا بھی تم پر رحم کرے گا (۳)۔

جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے، وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا، اس لئے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی (۴)۔

اس عام رحم دلی کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے جو بلاغت کی جان ہیں، فرمایا:

من لایرحم لا یُرحم (۵) — جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ان دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی، رحم دلی کا ہر منظر اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ ان ہی دو لفظوں سے ابھارا جا سکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا

---

(۱) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی رحمة الناس ج۲ ص۱۴ (۲) ادب المفرد باب رحمة البهائم ص۷۶

(۳) ایضاً باب ارحم من فی الارض ص۴۷ (۴) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی التحریش بین البهائم ج۱ ص۳۴۶ (۵) صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمة الناس والبهائم ج۲ ص۸۸۹۔

بھی رحم نہیں فرمائے گا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے، محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ''اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لئے اس میں مسلمان، کافر، مملوکہ اور غیر مملوکہ، جانور سبھی داخل ہیں اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا، ان پر ہلکا بوجھ لادنا اور ان کو بہت نہ مارنا، یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں''(۱)، غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غم خواری، بےکسوں کی تسکین، بیماروں کی تسلی، غریبوں کی امداد، مظلوموں کی حمایت اور زیردستوں کی اعانت کرتے ہیں، اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لئے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں، کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

---

(۱) فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۶۸ مصر۔

عدل وانصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو، تو اس کو عربی میں ''عدل'' کہتے ہیں (۱)، اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علمانے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے اور وہی کرتا ہے جو حق ہے'' (۲)، قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے، فرمایا:

وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ (مومن:۴۰-۲۰) اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

یہ عدلِ عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت میں ہے:

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ (احزاب:۳۳-۴) اور اللہ حق بات کہتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے عدلِ قولی کو ظاہر کرتا ہے اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یک جا ہیں:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (انعام:۶-۱۱۵) اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی۔

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے:

---

(۱) مفردات راغب اصفہانی ص ۳۲۷ مطبوعہ مصر (۲) کتاب الاسماء والصفات بیہقی ص ۶۱ الہ آباد۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ (آل عمران:۳-۱۸)

خدا نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے، وہی خدا انصاف کو لے کر کھڑا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل وانصاف صرف نظم وسلطنت ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں عدل کی ضرورت ہے اور نظامِ عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے ان میں سب سے پہلے عدل وانصاف ہی کرنے کا حکم ہے، فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل:۱۶-۹۰)

بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگذر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نظمِ عالم کو قائم رکھنے کے لئے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے، جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہ داشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے، پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل وانصاف کا حکم دیا ہے، مثلاً معاشرتی زندگی میں عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زاید عورتوں سے نکاح کرتے ہیں، اس لئے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (نساء:۴-۳)

پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کر سکو گے، تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمہارے قبضہ میں ہو۔

عورتوں کی طرح یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لئے بھی عدل وانصاف کی ضرورت ہے، اس لئے فرمایا:

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (نساء:۴-۱۲۷)

اور (خاص کر) یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔

عام معاملات میں عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید وفروخت میں وزن وپیمانہ میں ہے، اس لئے فرمایا:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (انعام:۶-۱۵۲)

اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو اور (پوری پوری) تول۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے، کیوں کہ خرید وفروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس لئے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ نہایت عام ووسیع ہے، اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی کرنے سے انسان کی سخت دنائت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل وانصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے، اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل وانصاف کا لحاظ رکھا ہے، تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ:

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (بقرہ:۲-۲۸۲)

اور (تمہارے باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔

فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْلَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ (بقرہ:۲-۲۸۲)

پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا، اگر وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے مطلب نہ کر سکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ فریقِ مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (انعام:۶-۱۵۲)

اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو (فریقِ مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ:۵-۸)

مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوۂ) انصاف پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی ومحبت تم کو بے انصاف نہ بنائے،

اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے اور یہ کہ ہر حال میں عدل وانصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے، اس پر بھی رسولِ اسلام علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے وحیِ الٰہی یہ کہلواتی ہے:

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۖ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۖ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ.

(شوریٰ: ۴۲-۱۵)

اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری اور مجھے (خدا سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے۔

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیتِ پاک میں ہے، اس کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچادوں، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے، بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل وانصاف کرتا ہے اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے، میرے خدا نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ عام وخاص اور امیر وغریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے، کیوں کہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اس کے غلام ہیں، اس لئے اس کے سب غلاموں کے لئے ایک ہی قانون ہونا چاہئے، ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا، اس میں جھگڑنے کی کوئی بات نہیں، سب کو قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو ویسا انعام ملے گا اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل وانصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل وانصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہلِ ایمان کو اس کٹھن منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشادِ خداوندی ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ

اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو، اللہ کے

شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا.

(نساء:۴-۱۳۵)

لئے گواہ بنو، اگرچہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو، یا ماں باپ کا، یا رشتہ داروں کا، اگر وہ دولت مند ہے، یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان ملو گے یا کچھ بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات میں عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور خدا واسطے کہو، عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا، نہ دولت مند کی طرف داری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کرو یا کہو، پھر سچ کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہہ میں پڑ جائے یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپا لو، تو یہ سب باتیں عدل وانصاف کے خلاف ہیں، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں ردوبدل کر دینا بہ ظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے، غرض یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لئے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرف دارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگراں نہیں ہو سکتا، اس لئے نہ گواہوں کو اس لئے طرف داری کرنی چاہئے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہئے، بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہئے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔

لوگ عدل وانصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لئے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر

میں سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے، جس میں ان کی بھلائی ہے، غور کیجئے کہ ان لفظوں میں عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لئے جھوٹ بولتا ہے، یا غلط فیصلہ دیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالاں کہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لئے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظمِ عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی، اور ظلم کی بنیاد رکھی جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہوجانے کا خطرہ ہے، غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع ونقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے، جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔

اسی لئے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں گناہ ہے اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں:

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.	اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

(بقرہ:۲-۱۸۸)

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے(۱)۔

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لئے اس میں بھی عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں اور ایک دوسرے کے سر وسینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو، اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل وانصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے، فرمایا:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ ۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى	اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک (فرقہ) دوسرے

(۱) تفسیر روح المعانی ج ۲ ص ۶۰۔

الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. (الحجرات:۴۹-۹)

پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے، پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

عدل وانصاف حکومت وسلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لئے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لئے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں، اسی لئے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو، ارشاد ہوا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (نساء:۴-۵۸)

بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے کا فیصل کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اہلِ تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں ''امانت'' سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دوسرے پر چاہئے، خدا نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حق دار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے، اور یہ فیصلہ دوست ودشمن، کافر ومسلم سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف کے ساتھ ہونا چاہئے، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا:

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. (مائدہ:۵-۴۲)

اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا، کیوں کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

عدل وانصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل وانصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے، یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے، تاہم اشاراتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوتِ نطق سے محروم نہ ہو، صاحبِ علم ہو، چنانچہ خداوند تعالیٰ

فرماتا ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.

(النحل:۱۶-۷۶)

اور خدا (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (ہیں) ان میں کا ایک گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا، کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں، جو (لوگوں کو) عدل وانصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفتِ نطق سے متصف ہونا چاہئے، ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا اور قادر ہونا چاہئے کیوں کہ حکم سے علوئے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے، اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوئے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا اور عالم ہونا چاہئے تا کہ ظلم وانصاف میں تمیز کر سکے، اس سے ثابت ہوا کہ عدل وانصاف کی صفت، قدرت اور علم دونوں کو شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہئے، پہلا شخص کسی قسم قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحبِ قدرت ہونا چاہئے، پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا، اس لئے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہئے تا کہ وہ ہر کام سلیقے سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل وانصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کے رو سے اگر چہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہئے، تا ہم امام وحاکمِ وقت کے لئے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لئے حدیث میں امامِ عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص امامِ عادل ہوگا" (۱)۔

---

(۱) بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش ج۲ص ۱۰۰۵۔

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول وقرار کرلیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ		بے شبہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
	(آل عمران: ۳-۹، رعد: ۱۳-۳۱)	
لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ	(زمر: ۳۹-۲۰)	اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ	(آل عمران: ۳-۱۹۴)	(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ	(روم: ۳۰-۶)	اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ	(حج: ۲۲-۴۷)	اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔
فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَہْدَہٗ	(بقرہ: ۲-۸۰)	تو البتہ اللہ اپنے قول وقرار کے خلاف نہ کرے گا۔
وَمَنْ اَوْفٰی بِعَہْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ	(توبہ: ۹-۱۱۱)	اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول وقرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے اور کسی سے جو قول وقرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے، وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لئے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے، ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے:

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا — اور اپنے قول وقرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔

(بقرہ:۲-۱۷۷)

بعض آیتوں میں اس کو کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۔ — اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔

(مومنون:۲۳-۸)

ایک دوسرے سورہ میں جنتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اس تصویر کا ایک رخ یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۔ — اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔

(معارج:۷۰-۳۲)

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم وکاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے، جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے، اس لئے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا، اس کے برعکس ایک آیت میں پہلے عہد کی عام پابندی کا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۔ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔

اور عہد کو پورا کیا کرو، کیوں کہ (قیامت میں) عہد کی بازپرس ہوگی اور جب ناپ کرو تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو، اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو، (معاملہ کا) یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔

(بنی اسرائیل:۱۷-۳۴و۳۵)

قانون یا رسم ورواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لئے تاکیداً پابندیِ عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لئے زبانی قول وقرار کی ضرورت نہیں، بلکہ عرفِ عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول وقرار ہیں۔

تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روزِ الست کو بندوں نے اپنے خدا

سے باندھا، اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے، تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول وقرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے، اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرتاً قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ. وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ (رعد:۱۳-۲۰و۲۱)

جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے اور جو خدا نے جن تعلقات کو جوڑنے کا حکم دیا ہے ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے اس فطری عہد کے ایفا کا ذکر ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اس قول وقرار کا جو باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے جو خاص کر اہلِ قرابت کے درمیان قائم ہے۔

سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے جو خدا کو حاضر وناظر بتا کر یا خدا کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں، فرمایا:

وَاَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عَاھَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ عَلَیْکُمْ کَفِیْلًا. (نحل:۱۶-۹۱)

اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو، اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے۔

اس معاہدہ کے عموم میں صحابۂ کرامؓ کے وہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کئے اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کئے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آجاتے ہیں جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمیں کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔

سورۂ انعام میں ایک اور عہدِ الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے، فرمایا:

وَبِعَھْدِ اللّٰہِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ. (انعام:۶-۱۵۲)

اور اللہ کا قرار پورا کرو، یہ اس نے تم کو نصیحت کردی ہے تاکہ تم دھیان رکھو۔

اس عہدِ الٰہی میں خدا کے وہ فطری احکام بھی داخل ہیں جن کے بجالانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے یا خدا نے تم سے لیا ہے، اسی طرح اس نذر اور منت کو مشتمل ہے جس کو خدا کے مقدس نام

سے تم نے مانا ہے اور انسانوں کے اس باہمی قول وقرار کو بھی شامل ہے جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بہ روز گھٹتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی، اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا، مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی تھی کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی اجازت گو دے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا، پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی مہلت دو:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ. فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ (توبہ:۹-۱و۲)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے، جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لو (تم اے مشرکو!) ملک میں چار مہینے اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنہوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا، فرمایا:

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (توبہ:۹-۴)

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انہوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقویٰ والے۔

اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا، آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنہوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ ان مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنہوں نے

اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ.

مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو، مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔

(توبہ:۹-۷)

''سیدھے رہنے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں، تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو اور جو لوگ اپنے اس عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے، جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ:۵-۱) مسلمانو! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاحِ شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

''اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ'' خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے'' يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ' اور اس قول میں تمام عقد مثلاً عقد بیع، عقد شرکت، عقد یمین، عقد نذر، عقد صلح اور عقد نکاح داخل ہیں، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضا یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے، اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے''(۱)۔

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہاں تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے حسنِ عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی

(۱) تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۸۵۔

ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیش تر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیتاً بھیجا کرتے تھے" (۱) یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو ان کی زندگی میں جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے، جس کی سرخی یہ ہے "حسن العهد من الایمان" اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہیں، تمہارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟ اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا عائشہ، یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسنِ عہد ایمان سے ہے" (۲) یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسبِ توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے:

لادین لمن لاعهد له (۳) — جس میں عہد نہیں، اس میں دین نہیں۔

(احمد، طبرانی وابن حبان)

یعنی اس قول و قرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے، جس کے مجموعہ کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا وہ دین کی روح سے محروم ہے۔

☆

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب حسن العهد من الایمان ج ۲ ص ۸۸۸ (۲) فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۶۵ (۳) مسند ج ۳ ص ۱۳۵ و ۱۵۴ و ۲۱۰ و ۲۵۱۔

احسان یعنی بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے اور اس لئے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا، جس کے احسانات کی حد و پایاں نہیں، عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ. (ابراہیم:۱۴-۳۴)

اور اگر اللہ کے احسان گنو تو ان کو پورا نہ گن سکو گے، بے شک انسان بے انصاف ناشکرا ہے۔

حضرت یوسفؑ خدائے تعالیٰ کے اس احسان (۱) کا شکر کہ اس نے کسی سعی و سفارش کے بغیر ان کو قید خانے سے نجات دی، اور وہ ان کے ماں باپ اور بھائیوں کو مصر لے آیا، ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں:

---

(۱) اس موقع پر ایک بات خیال میں رہے، عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقے سے کرنے کے ہیں، اردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں، عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں "الی" یا "ب" کے صلہ کے ساتھ ہوگا، قرآن پاک میں جہاں جہاں مُحْسِنٌ، مُحْسِنِيْنَ یا مُحْسِنُوْنَ کے لفظ بلا صلہ آئے ہیں، ان سے حسب موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لئے جائیں گے، اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہوسکتا ہے، لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے جیسے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (توبہ:۹-۱۲۰)

بے شبہ خدا اچھے کام کرنے والوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا۔

لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (زمر:۳۹-۵۸)

کاش اگر میرے لئے لوٹ کر جینا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران:۳-۱۳۴)

اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ (یوسف:۱۲-۱۰۰)

اور خدا نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانہ سے باہر لایا اور آپ لوگوں کو گاؤں سے یہاں لے آیا۔

اسی طرح قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کے صفتِ محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے، فرمایا:

اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (قصص:۲۸-۷۷)

تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا۔

اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر ادلا بدلا اور داد و ستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامن گیر ہے، احسان، حسنِ سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے اور قرآن مجید میں جا بجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے، چنانچہ سورۂ نحل میں حکم کی صورت میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی (نحل:۱۶-۹۰)

اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروانہیں کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابت دار، یتیم محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اس لئے خداوند تعالیٰ نے سورہ نساء کی ایک آیت میں (۴-۳۶) ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے، (بقرہ:۲-۸۳) (انعام: ۶-۱۵۱) (اسرائیل:۱۷-۲،۳) (احقاف:۴۶-۱۵)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے، اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا:

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص:۲۸-۷۷)

اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں:

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ (یوسف:۱۲-۱۰۰)

اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کئے ہیں، کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، ان کے علاوہ اور بھی سیکروں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں جن کو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا، جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو، فرمایا:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (بقرہ:۲-۲۲۹)

طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا ہے وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو) دو دفعہ (کر کے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو اور اس کی ادائی میں لیت ولعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو، فرمایا:

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ (بقرہ:۲-۱۷۸)

پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جز (قصاص) معاف کر دیا جائے تو (جان کے بدلے خوں بہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارث مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خوں بہا کا) ادا کر دینا۔

قصورواروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی خدا کے محبوب

بندوں میں ہوں گے:

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ. (آل عمران:۳-۱۳۴)	اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔

احسان کے لئے قرآن کا ایک اور لفظ فَضل ہے، اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کئے بغیر اس کو طلاق دے دے تو شوہر پر نصف (۱) مہر واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا، مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے، اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسنِ خلق ہے، اور یا شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں تو یہ مرد کا حسنِ خلق ہے (۲)، اس کے بعد ارشاد ہے:

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ. (بقرہ:۲-۲۳۷)	اور آپس میں فضل کو مت بھولو، بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

کسی غریب یا کسی عزیز، قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے تو بھی احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں (۳)، فرمایا:

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُھٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا (نور:۲۴-۲۲)	اور تم میں جو احسان اور کشایش والے ہیں وہ قرابت داروں، غریبوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں، ان کو چاہئے کہ معاف کریں اور درگذر کریں۔

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک اور جامع لفظ ''معروف'' کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو، معروف میں داخل ہے، قرآن پاک کا حکم ہے وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ (اعراف:۷-۱۹۹) اور نیکی کرنے کو کہہ اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

کل معروف صدقة (۴)	ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لئے غریب و امیر کی تخصیص نہیں، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''اگر اس کے

(۱) یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہو چکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔ (۲) سعید سے روایت ہے ''آپس میں فضل کو مت بھولو''، ''یعنی احسان کو مت بھولو'' ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۰ مصر (۳) کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکورہ ج ۱ ص ۱۶۲ بعضوں نے یہاں ''فضل'' سے فضیلتِ دینی اور کسی نے فضلِ مالی مراد لیا ہے۔ (۴) صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقة ج ۲ ص ۸۹۰۔

پاس مال نہ ہو تو کیا کرے" فرمایا "کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے"، صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے"، فرمایا "غریب حاجت مند کی اعانت کرے"، صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟ فرمایا "نیکی کے کرنے کا حکم دے" صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے، ارشاد ہوا کہ "برائی سے باز رہے، کیوں کہ یہ اس کے لئے صدقہ ہے" اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ "آدمی اپنے اہل وعیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وہ صدقہ ہے، کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے" (۱)۔

اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ "بر" کا استعمال کیا ہے اور اس وسیع دائرے میں کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ (ممتحنہ:۶۰-۸)	جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو خدا تم کو منع نہیں کرتا، (کیوں کہ) اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صحابہؓ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نا مسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمہارا کام نہیں، میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہئے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا (۲)، ارشاد ہوا:

لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (بقرہ:۲-۲۷۲)	تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا، لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا۔

گویہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔

نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب وعذاب کا دارومدار ہے جو نیک کام کریں گے ان کو خدا کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی، ارشاد ہوا:

---

(۱) صحیح بخاری حوالہ سابق مع فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۷۴ (۲) ابن جریر ج ۳ ص ۵۸، ۵۹ و ابن کثیر ج ۱ ص ۳۲۳ بحوالہ نسائی تفسیر آیت مذکورہ۔

هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ اِلَّا الْإِحْسَانُ. بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر بھلائی۔

(رحمٰن:۵۵-۶۰)

گویہ آیت پاک اپنے سباق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے، قرض داروں پر احسان کرنا، ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگ دست مقروضوں کو مہلت دینا، جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہوں ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔

عرب میں سود خواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض نہیں ادا کر سکتے تھے، وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دئے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لئے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ:۲-۲۸۰)

اور اگر (کوئی) تنگ دست (تمہارا مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ ”قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا، جن میں ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا، اور اس کی قیمت کھائی“ (۱)، اس کو اور بھی موکد کر دیا، اور قرض کے معاملہ میں تنگ دستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں، یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہیں کرتا تھا، لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقروض تنگ دست

(۱) بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حرا ج ۱ ص ۲۹۷ مع فتح الباری۔

نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو، شاید خدا ہم سے بھی درگذر کرے، چنانچہ خدا نے اس کے صلہ میں اس سے درگذر کیا، دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں، فرشتوں نے کہا ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں میں آسانی کرتا تھا اور اگر تنگ دست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا اور تنگ دست کا قرض چھوڑ دیتا تھا (۱)۔

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے، وہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے (۲) یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرض دار کو مہلت دے گا یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا (۳)۔

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے، زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو'' (۴)۔

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہئے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر پوچھا کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! میں کسی شخص کے پاس سے گذرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا تو کیا جب اس کا گذر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں''، فرمایا ''نہیں تم اس کی مہمانی کرو'' (۵)۔

(۱) بخاری کتاب البیوع باب من انظر معسرا ج ا ص ۲۷۸ و باب من انظر موسرا ص ۲۷۹ صحیح مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار المعسر ج ا ص ۶۲۲ (۲) مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار المعسر ج ا ص ۶۲۳
(۳) مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۳۰۸ (۴) صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح ج ۲ ص ۱۵۷، ۱۵۸
(۵) جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الاحسان والعفو ج ۲ ص ۲۱۔

ایک موقع پر ارشاد ہوا ''ایسے نہ بنو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو، کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کرلو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو'' (۱)۔

لوگ احسان کو غلطی سے دولت وتمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کرسکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لئے دولت کی نہیں، دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے، حضرت براءؓ بن عازب صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا ''تمہاری تقریر گو مختصر ہے لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے، تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ''، اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا ''نہیں، اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے اور دوسرے کے ساتھ شریک ہوکر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو، اگر تم یہ بھی نہ کرسکو تو بھوکے کو کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو اور اگر یہ بھی نہ کرسکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو'' (۲)۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے، فرمایا ''جو روزی خدا نے دی اس میں سے دوسروں کو دے''، عرض کی ''اے خدا کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو''، فرمایا ''اپنی زبان سے نیک کام کرے''، عرض کی ''اگر اس کی زبان معذور ہو'' فرمایا ''مغلوب کی مدد کرے''، عرض کی ''اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو''، فرمایا ''جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کردے''، عرض کی ''اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو''، فرمایا اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے'' (۳)۔

☆

(۱) جامع ترمذی حوالہ سابق (۲) مستدرک حاکم کتاب المکاتب ج ۲ ص ۲۱۷ (۳) مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۳۔

عفو درگذر

عفو درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہوتو دنیا ایک لمحہ کے لئے بھی آباد نہ رہے اوردم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عَفُوٌّ (درگذر کرنے والا) غَافِرٌ غَفُوْرٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنے والا ہے) اس کی شان یہ ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (شوریٰ:۴۲-۲۵)
اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

وہ چاہےتو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کردے یا ان کو معاف کردے، فرمایا:

اَوْ یُوْبِقْهُنَّ بِمَا کَسَبُوْا وَیَعْفُ عَنْ کَثِیْرٍ (شوریٰ:۴۲-۳۴)
(اگر خدا چاہےتو) گنہ گاروں کو ان کے کرتوت کے سبب تباہ کردے اور بہتوں کو معاف کردے۔

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے:

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی. (طٰہٰ:۲۰-۸۲)
اور اس میں شبہہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشایش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے، پھر راہ پر رہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غَافِرٌ (بخشنے والا) پانچ دفعہ غَفَّارٌ (بڑی بخشایش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عَفُوٌّ (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غَفُوْرٌ (بخشنے والا) کہا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفو درگذر کا سمندر کس زور وشور سے جوش ماررہا ہے، خدا نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے، فرماتا ہے:

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَفُوًّا
یا کسی برائی کو معاف کرو تو بے شک ہے اللہ معاف کرنے

قَدِیْرًا۔ (نساء:۴-۱۴۹) والا قدرت والا۔

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے، تو اس کی قدرت بہرحال کامل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصورواروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے، تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے، اسی طرح ہم کو چاہئے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں (۱)۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے، فرمایا:

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (نور:۲۴-۲۲) اور چاہئے کہ وہ معاف کردیں اور درگذر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا مہروالا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو خدا تمہیں معاف کرے گا اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابرِ کرم کی کچھ چھینٹیں پڑنی چاہئیں، چنانچہ جن مومنوں کے لئے خدا نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے، ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ. (شوریٰ:۴۲-۳۷) اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں، جتنا غصہ کی حالت میں، جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمانِ کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصوروالوں کو معاف کردیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلاف درمیان میں ہے کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے، ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں، ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

---

(۱) تفسیر ابن جریر طبری پارہ ۶ ج ۶ ص ۴ و بحر محیط ابن حبان تفسیر سورہ نساء ج ۳ ص ۳۸۵۔

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ. خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ.

(اعراف:۷-۱۹۸،۱۹۹)

اور اگر تم ان کو راہِ راست کی طرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں اور (بہ ظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، حالاں کہ وہ دیکھتے نہیں، (اے پیغمبر) درگذر (کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔

کیوں کہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو تبلیغ ودعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے، خدا نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو، صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ.

(مومنون:۲۳-۹۶)

(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔

مذہبی جماعت کے لئے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے جب کچھ لوگ ان لوگوں کو بھی ان سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں، لیکن خدا نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو و درگذر کا حکم دیا ہے:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

(بقرہ:۲-۱۰۹)

(مسلمانو!) اکثر اہلِ کتاب باجودے کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے، (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں، تو معاف کرو اور درگذر کرو، یہاں تک کہ خدا اپنا حکم صادر فرمائے۔

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے، اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہئے، کیوں کہ وہ اگر نہیں تو تم تو قیامت کی جزا و سزا کے قائل ہو، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ ان کو مل جائے گا، فرمایا:

قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ. (جاثیہ:۴۵-۱۴،۱۵)

ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے جزاوسزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کردیا کریں تاکہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے، جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھلے کے لئے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی، اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفوودرگزر (۱) کی نصیحت فرمائی (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا ج ۵ ص ۵۸۹)۔

---

(۱) اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفوودرگزر کی نصیحت ہے، عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے، جہاد نے کفار کے حق میں عفوودرگزر کے ہر حکم کو منسوخ کردیا ہے، لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفوودرگزر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لئے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے، امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے، لکھتے ہیں:

"اس آیت وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (اعراف:۷-۱۹۹) میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں، کیوں کہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہوسکتی ہیں تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں، مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ ومنسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں۔" (جلد۴ صفحہ ۴۹۶)

ایک اور آیت اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (مومنون:۲۳-۹۶) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیوں کہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے، جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو۔ (جلد۶ صفحہ ۳۰۰)

آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (فرقان:۲۵-۶۳) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کردیا، لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے اور عزت وآبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہے۔" (جلد۶ صفحہ ۴۹۷ طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر) (بقیہ حاشیہ ص ۳۱۴ پر)

غم وغصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت وآبرو پر حملہ کیا جائے، لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو ودرگزر سے کام لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہؓ کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی مالی امداد بند کردی (۱)، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ.

(نور:۲۴-۲۲)

اور تم میں سے جو لوگ صاحبِ احسان اور کشائش والے ہیں قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں، بلکہ (چاہئے کہ ان کے قصور) بخش دیں اور درگزر کریں، (مسلمانو!) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کردے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۴)

آیت يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا (جاثیہ: ۴۵-۱۴) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیوں کہ کفار پر عفو وکرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ ان سے قتال نہ کیا جائے، لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو وکرم کے حکم کا نسخ ہوگیا، لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگزر کیا جائے۔'' (جلد ۷ صفحہ ۴۸۴ طبع مذکور)

میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے ان ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوقِ عباد ہیں، یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کردیں، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے کفر وشرک اور عصیانِ الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں اور قتال وجہاد حقوقِ الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے، اس لئے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو ودرگزر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں۔

درمنثور میں ابن عساکر سے حضرت ابومسلم خولانیؓ صحابی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا، اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (جلد ۶ صفحہ ۳۵ مصر)

---

(۱) تفسیر کبیر امام رازی ج ۶ تفسیر سورہ نور ص ۶۵۲ ''ک، ص''۔

اس آیت کے آخری ٹکڑہ سے بھی ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگزر فرمائے گا، یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ. الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ. (آل عمران: ۳-۱۳۳،۱۳۴)

اور اپنے پروردگار کی بخشایش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان، (کا پھیلاؤ، بجی سجائی) ان پرہیزگاروں کے لئے تیار ہے جو خوش حالی اور تنگ دستی (دونوں حالتوں) میں (خدا کے نام پر) خرچ کرتے اور غصہ کو روکتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگذر کرتے ہیں اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہ خدا میں دینا اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا اور ان کے لئے دو جزائیں، ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت، بیان کی گئی ہیں، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو وہ جنت ہے جس کی حد و پایاں آسمان و زمین ہے اور غصہ کو روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ہمارے شامل حال ہوگی اور وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا۔

عفو و درگزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جز شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مرادف ہو جائے، اسی لئے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طپانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو، جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے، کیوں کہ اسلام نے عفو درگزر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ. وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ

اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لے لیتے

فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ. (شوریٰ:۴۲-۳۹،۴۰)

ہیں اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی، اس پر (بھی) جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

برائی کا بدلہ برائی جماعت کا قانون ہے اور عفو و درگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفو و درگزر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے، جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب ظلم کر بیٹھیں یا وہ جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں، خدا کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگزر خودداری کے منافی نہیں ہوتا، بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے، کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگزر کرتا ہے، اسی لئے فرمایا:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (شوریٰ:۴۲-۴۳)

اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا بخش) دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے، اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیوں کر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ. وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (حم سجدہ:۴۱-۳۴ تا ۳۶)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، (اگر کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی سے دو، پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا گویا دوست ہے، ناتے والا اور یہ بات ملتی ہے ان ہی کو جن میں صبر ہے، اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قیمت ہے، اور اگر (اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ، بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگزر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے وہ شیطانی کام ہے، اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے،

حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا:

''خدا نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ وغضب میں صبر کا اور نادانی وجہالت کے وقت حلم وبردباری کا اور برائی کے مقابلہ میں عفوودرگزر کا حکم دیا ہے، جب وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا''(۱)۔

ابومسعودؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو ماررہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، جان لو، جان لو، مڑکر دیکھا تو آنحضرت ﷺ فرمارہے تھے کہ اے ابومسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے، ابومسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضور انور ﷺ سے آکر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں، آپ ﷺ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر یہی پوچھا تب آپ ﷺ نے فرمایا ''ہرروز ستر دفعہ''(۲)، اس سے مقصودِ نبوی ﷺ تعداد کی تحدید نہیں، بلکہ عفوودرگزر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفوودرگزر سے ان کے رعب وداب اور وقار میں فرق آجائے گا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، انتقام سے گوفوری جذبہ کی تسکین ہوجاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے، مگر اس سے کسی پائدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا، یہ چیز عفوودرگزر ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے(۳):

وما زاد اللہ رجلا بعفو الا عزا — اور اللہ اس شخص کو جو عفوودرگزر کرتا ہے نہیں بڑھاتا مگر عزت میں۔

---

(۱) ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم تفسیر سورہ حٰم السجدہ ج ۴ ص ۱۰۱ آیت مذکور (۲) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب النھی عن ضرب الخدم وشتمھم وباب ماجاء فی العفو عن الخادم ج ۲ ص ۱۶ میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔

(۳) ایضاً باب ماجاء فی التواضع ج ۲ ص ۲۳۔

حلم وبردباری

حلم وبردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کرلیاجائے اور قصوروار سے اس کے لئے کوئی تعرض نہ کیا جائے، یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور انتقام نہیں لیتا اور اسی لئے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے، اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کردیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا:

وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ. (بقرہ:۲-۲۵۵، مائدہ:۵-۱۰۱) اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ. (آل عمران:۳-۱۵۵) بے شک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا. بے شک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔

(اسرائیل:۱۷-۴۴، فاطر:۳۵-۴۱)

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ مغفرت کا ذکر کردیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدمِ قدرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی شانِ غفاری کا نتیجہ ہے، دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ. (نساء:۴-۱۲) اور اللہ ہے جاننے والا بردبار۔

اِنَّ اللّٰہَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ. (حج:۲۲-۵۹) بے شک ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا. (احزاب:۳۳-۵۱) اور ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا، بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہوکر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفتِ استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے:

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ. (بقرہ:۲-۲۶۳) اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے۔

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لئے یہ ظاہر فرمادیا کہ وہ مستغنی ہے اور بردبار ہے۔

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً انتقام کے مقابلہ میں حلم، اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لئے کسی کو زیادہ قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے، اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے، لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے اور اسی لئے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا، اس لئے اس نے اپنے حلم اور دار و گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دیا ہے، تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْہُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۔ (بقرہ:۲-۲۳۵)

اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشش والا ہے، تحمل والا۔

یہ آیت عورت کے نکاحِ ثانی کے سلسلہ میں ہے، یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے، دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں، اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے، ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اس لئے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو، دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے، اس لئے اس سے پرامید بھی رہنا چاہئے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے، اس موقع پر اس کا ارشاد ہے:

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ۔ (تغابن:۶۴-۱۷)

اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دونا کردے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ ہے قدردان اور تحمل والا۔

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف

کرے گا۔

اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں، اس لئے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے، لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے یا اس میں ایک عیب ہے، مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگزر کرنا آسان ہو جاتا ہے، چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگزر کرتا ہے۔

صفتِ حلم سے انبیائے کرام علیہم السلام بھی متصف فرمائے گئے ہیں، حضرت ابراہیمؑ، اور حضرت اسماعیلؑ جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذابِ الٰہی سے بچ جائے، انہوں نے اس کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علاحدگی پر مجبور ہوئے، پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے جب تک ان کو پوری مایوسی نہیں ہوگئی اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہوگیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ.

(توبہ: ۹-۱۱۴)

اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہوگیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہوگئے، بے شک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے، (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود خدا سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا)۔

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قومِ لوط کی بربادی کی خبر پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض

معروض کرتے ہیں، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاہٌ مُّنِیْبٌ. بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔ (ھود:۱۱-۷۵)

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم، عفوو درگزر، رفق وملاطفت اور صبر واستقلال کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنی توصیف میں حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف میں اَوَّاہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لئے عفوو درگزر اور رفق وملاطفت لازمی ہیں، لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیلؑ کی نسبت فرمایا ہے:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ. (صٰفّٰت:۳۷-۱۰۱) تو ہم نے ان کو (ابراہیم کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسماعیل کے پیدا ہونے) کی خوش خبری دی۔

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا ہے:

یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ. (صٰفّٰت:۳۷-۱۰۲) اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اس کی تعمیل کیجئے، ان شاءاللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جز ہے، حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہے، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو خدا پسند کرتا ہے، یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا(۱) یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہئے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، آپ ﷺ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ "غصہ نہ کرو" اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے"(۲)، ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص

(۱) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التانی والعجلۃ ج۲ص۲۱ (۲) بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب ج۲ص۹۰۳۔

کا مستحق ٹھہرائے گا‘‘(۱)۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ ملتا ہوں(۲) وہ کاٹتے ہیں، میں بھلائی کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں میں تحمل کو راہ دیتا ہوں، آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ ’’اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی‘‘(۳)۔

---

(۱) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب ج۲ ص۲۲ (۲) یعنی صلہ رحم کرتا ہوں۔ (۳) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب صلۃ الرحم ج۲ ص۳۷۹، ۳۸۰ وادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم ص۱۳۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بہ جائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے، جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو لَطِیفٌ فرمایا ہے(۱)، اور حدیثوں میں اس کا نام رفیق آیا ہے(۲)، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا

---

(۱) راغب اصفہانی "لطیف" کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں:

"وہ اپنے بندوں کی رہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے"۔ (لفظ لطف، المفردات فی غریب القرآن لام مع الطاص ۴۶۶)

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں:

"خدا کا نام لطیف اس لئے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لئے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے.......... لطیف اس لئے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا.......... ابن الاعرابی کا قول ہے، لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے"۔ (صفحہ ۴۷ الہ آباد)

امام غزالیؒ کہتے ہیں:

"اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو نرمی کے طریق سے، سختی سے نہیں، اس تک پہنچاتا ہے، جس کے حق میں وہ مفید ہیں، جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لئے ہے۔" (روح المعانی تفسیر سورہ شوریٰ پارہ ۲۵، جزء ۲۵ صفحہ ۲۵)

(۲) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الرفق ج ۲ ص ۳۹۰۔

سامان پہنچانے میں رفق ولطف فرماتا ہے اور اپنے اس تلطف میں وہ ان کی اطاعت اور عدمِ اطاعت کی پروانہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم وشرمندہ کر کے ان کے آگے سرنگوں کر دیا اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں:

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ۔ (یوسف:۱۲-۱۰۰)

بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے، بے شک وہی علم والا، حکمت والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں، ان کی حکمت کو خدا ہی جانتا تھا اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ اپنے رفق وتلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے:

اَللّٰهُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ۔ (شوریٰ:۴۲-۱۹)

اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہی قوت والا غالب ہے۔

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے، بیچ میں یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر ومومن دونوں کے ساتھ ہے کہ دونوں کو یکساں وہ رزق پہنچاتا ہے (۱)، اور اسی لئے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطافِ بے کراں کا ایک نتیجہ ہے۔

ملتِ حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہِ الٰہی میں گو یہ دعا مستجاب (۲) نہ ہوئی، مگر ابراہیم خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا:

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ۔ (توبہ:۹-۱۱۴)

بے شک ابراہیم نرم دل بردبار تھے۔

اسی طرح جب وہ قومِ لوط کی گنہ گار قوم کی سفارش کے لئے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی مگر حضرت ابراہیمؑ کی مدح وتوصیف فرمائی گئی کہ:

---

(۱) تفسیر روح المعانی میں مقاتل کا یہی قول ہے، صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو اوضح جانتے ہیں ج ۲۵ ص ۲۵

(۲) حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پا کر اس کے بعد ان سے اپنی علاحدگی ظاہر کر دی۔

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ. (ھود:۱۱-۷۵)　　بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

اَوّاہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائیں مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے اور تیسرا دردمند کہتا ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں، وہ ہر شخص کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے یا دل کے نرم تھے اس لئے جلد پسیج جاتے تھے اور یہ اس لئے ایسا تھا کہ ملت حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا، چنانچہ اسی لئے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون جیسے سنگ دل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کو بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں:

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى. (طٰہٰ:۲۰-۴۴)　　سو تم اس سے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت پائے یا (خدا سے) ڈرے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لئے دینِ حنیف کے مبلغِ اعظم اور توحید کے داعیٔ اکبر محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصۂ وافر عنایت فرمایا تھا، خود حضور ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران:۳-۱۵۹)　　تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے لئے نرم دل ہوئے، اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہوگئے ہوتے۔

اس لئے ایک پیغمبر کے لئے یہ وصف نہایت اہم ہے، تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لئے رحمتِ عالم ﷺ کی ذاتِ پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگزر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے، جس طرح حسنِ فطرت زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے، اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند

ہو جاتا ہے، آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی، فرمایا:

ان الرفق لایکون فی شیءٍ الا زانه ولاینزع من شیءٍ الا شانه (۱)	نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے، اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔

''جس چیز'' کا لفظ کتنا عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور سختی بگاڑتی ہے، الا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔

حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا نرم خو رفیق ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا'' (۲)، جریر بن عبد اللہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا'' (۳) اور فرمایا کہ ''تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی خدا اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا'' (۴)۔

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ ﷺ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی:

الا اخبر کم بمن یحرم علی النار وتحرم علیه النار علی کل قریب هین سهل (۵)	کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ السام علیکم یعنی تم کو موت آئے، حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں اور انہوں نے جواب میں کہا ''وعلیکم السام واللعنة'' یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''عائشہؓ ٹھہر جاؤ، خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے، بولیں یا رسول اللہ ﷺ! انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہیں سنا، فرمایا میں نے بھی تو کہہ دیا کہ علیکم ''یعنی تم پر'' (۶)۔

آنحضرت ﷺ کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی مگر اس میں سختی کا نشان نہیں،

---

(۱)، (۲)، (۳) صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب فضل الرفق ج۲ص۳۹۰ (۴) ترمذی ابواب الزهد ابواب صفة القیامة ج۲ص۷۶ (۵) ایضاً ابواب الزهد ابواب صفة القیامة ج۲ص۷۵ (۶) بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کله ج۲ص۸۹۰۔

اور پھراس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بہ خود اس کا دل شرمندہ ہو۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدودِ الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے قلع وقمع کرنے کے لئے ان پر پوری سختی کی جاسکتی ہے، فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (تحریم:۶۶-۹)

اے پیغمبر! کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی رکھو۔

دوسری جگہ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً (توبہ:۹-۱۲۳)

اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہئے وہ تم میں کڑا پن پائیں۔

اسی طرح شریعت کے گنہ گاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کے اجرا میں نرمی نہ برتیں، مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نور:۲۴-۲)

اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

آنحضرت ﷺ کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے، ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا، البتہ جب احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے“ (۱)، امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں آپ ﷺ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے (۲)، حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:-

”گویا امام بخاریؒ اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ

(۱) بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یسروا ولاتعسروا ج۲ص۹۰۴ (۲) ایضاً باب مایجوز من الغضب والشدة لامر اللہ تعالیٰ ج۲ص۹۰۲۔

رسول اللہ ﷺ تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے، لیکن خدا کے حق میں آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا(۱)''۔

آنحضرت ﷺ صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ''آسانی کرو، سختی نہ کرو''(۲) شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل ومباحات میں سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجایش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے، ایک صحابیؓ سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہوگئی، انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور ﷺ کی خدمت میں لے چلو، ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا، تو انہوں نے اکیلے ہی خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر حقیقتِ حال عرض کی، ارشاد ہوا کہ ''ایک غلام کی گردن آزاد کرو''، وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ ''یا رسول اللہ ﷺ اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں''، فرمایا لگا تار دو مہینے روزے رکھو''، گذارش کی کہ ''یا رسول اللہ! روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی پھر روزہ رکھوں''، فرمایا ''ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ'' عرض پرداز ہوئے کہ ''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گذاری ہے'' فرمایا کہ ''صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو، اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ'' وہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم میں آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ ''میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی ﷺ کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی''(۳)۔

☆

(۱) فتح الباری جلد ۱۰ ص ۴۲۹ مصر (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب یسرا ولا تعسرا ج ۲ ص ۹۰۴ (۳) سنن ابی داؤد کتاب الطلاق باب فی الظہار ص ۳۰۱۔

تواضع وخاک ساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے، جس میں کوئی اس کا شریک نہیں:

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (جاثیہ:۴۵-۳۷)	اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا۔

اس لئے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع وخاک ساری اختیار کریں اور عاجزی وفروتنی برتیں۔

تواضع وخاک ساری کے بہت سے مظہر ہیں، قرآن مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کو پہلے کفار سے درگزر کا، پھر مومنوں کے ساتھ پرمحبت وتواضع کا حکم دیا ہے:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ. (حجر:۱۵-۸۸)	اور اپنا بازو مومنوں کے لئے جھکادے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (شعراء:۲۶-۲۱۵)	اور اپنا بازو جھکا رکھ ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے۔

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پرمحبت، عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہئے:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل:۱۷-۲۴)	اور ماں باپ کے لئے عاجزی کا بازو مہر ومحبت سے جھکادے۔

''خفضِ جناح''، یعنی باز و جھکادینا، تواضع وخاک ساری سے استعارہ ہے، جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکادیتا ہے، اس سے یہ استعارہ (۱) کیا گیا کہ انسان بھی خاک ساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں

(۱) کتاب المثل السائر باب النوع الثانی فی التشبیہ ص ۱۶۰ مطبوعہ مصر ۱۳۱۲ھ وتفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جَنَاحَ الذُّلِّ ج ۵ ص ۵۷۴، دار الطباعۃ العامرہ۔

کو نیچے کر لیتا ہے، اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بہ جائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا. (الفرقان: ۲۵-۶۳)	اور رحمت والے (خدا) کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاک ساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے خدا کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی کہ خدا جب رحمت اور مہر و کرم والا ہے تو اس کے بندوں میں خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور ملن ساری ظاہر ہو۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ. (لقمان: ۳۱-۱۸، ۱۹)	اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین پر اترا کر نہ چل، (کیوں کہ) اللہ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے سے بول (کیوں کہ) بری سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔

اس آیت میں خاک ساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں، بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع و خاک ساری اور دنائت و پستی میں بڑا فرق ہے، تواضع و خاک ساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر و غرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے اور دنائت و پستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لئے انسان اپنی خودداری کھو دے، چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاک سارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خوددارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے، صحابہؓ جب عمرہ کے لئے آئے تو چوں کہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر رکھا تھا، اس لئے کفار نے طنز کیا کہ محمد اور ان کے اصحاب ضعف کی وجہ سے خانۂ کعبہ

کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ طواف کا تین چکر اکڑ کر کریں، تا کہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو(۱)۔

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے خاک ساری کے بہ جائے کبر وغرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ وصدقہ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے اور ظلم وفخر پر اترانا ناپسند (۲)۔

بہرحال اسلام میں خاک ساری ایک شریفانہ خلق ہے اور ضعف، ذلت، بے چارگی اور بے سروسامانی سے مختلف ہے، ضعف وذلت سے انسان پست رتبہ ہوجاتا ہے، لیکن خاک ساری اس کو بلند رتبہ بنادیتی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص خدا کے لئے خاک ساری کرتا ہے خدا اس کو بلند کردیتا ہے'' (۳)، ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ''جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن وہ خاک ساری سے اس کو نہیں پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلہ پسند کرے اس کو پہن لے'' (۴)۔

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لئے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاک ساری اختیار کرو تا کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے'' (۵)، اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوش گوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاک سار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہئے۔

---

(۱) مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف ج۱ص۴۸۵ وصحیح بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء النبی ج۲ص۶۱۱ (۲) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب ص۳۶۰ (۳) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی التواضع ج۲ص۲۳ (۴) ترمذی ابواب الزہد ابواب صفۃ القیامۃ ج۲ص۷۵ (۵) ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ والتواضع ص۶۷۱۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب واحترام اور لطف ومحبت کا پہلو ملحوظ رکھے، تاکہ آپس میں خوش گوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مروت اور محبت بڑھے، سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا، اچھی باتیں کرنا، اچھی باتیں سمجھانا، اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں، خدا تعالیٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا اس کو قرآن پاک میں بھی دہرادیا ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ:۲-۸۳)

اور کہیو لوگوں سے اچھی بات۔

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے، ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے، ارشاد ہے:

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا۔ (بنی اسرائیل:۱۷-۵۳)

اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بے شک شیطان جھڑپواتا ہے آپس میں، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے، کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے اور بدگوئی وبدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے، جو شیطان کا کام ہے، وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے، اس لئے اللہ کے بندوں کو چاہئے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے لہجہ میں کہیں اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں ملاپ اور مہرومحبت پیدا ہو، اسی لئے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے، کسی کو کافر یا منافق اور تحقیر وکراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہیں پہلے ہی سے نفرت

اور ضد کا جذبہ پیدا کردیتا ہے، فرمایا:

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ
(حجرات: ۴۹-۱۱)

اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو، اور نہ چڑ کا نام لے کر پکارو، ایمان کے بعد گنہگاری برا نام ہے۔

اسی لئے برائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ
(نساء: ۴-۱۴۸)

اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے“ (۱)، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہئے، اس کی زبان سے حق وصداقت، بہبودی وخیر خواہی اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اچھی بات بولے، ورنہ چپ رہے“ (۲)، اس حدیثِ پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ کلمۂ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے، کیوں کہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا، اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل رہے گی، ایک دفعہ آپ ﷺ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا، پھر ارشاد فرمایا ”دوزخ سے بچو، اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے“ (۳)۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا، ایک بدوی صحابی مجلس میں حاضر تھے، بے تابانہ بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو (۴)۔

---

(۱) ترمذی کتاب البر والصلة باب ماجاء فی اللعنة ج۲ص۱۸، ۱۹ (۲) صحیح مسلم کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف ولزوم الصمت ج۱ص۳۸ (۳) صحیح بخاری کتاب الادب باب طیب الکلام ج۲ص۸۹۰ (۴) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی قول المعروف ج۲ص۱۹۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اچھی بات صدقہ ہے'' (۱)، یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دل جوئی کی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جاسکتا ہے، اور سچی سعی وسفارش سے اس کو مدد پہنچائی جاسکتی ہے۔

ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ ''یارسول اللہ ﷺ نجات کیوں کر ملے'' فرمایا ''اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو'' (۲)، ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے، آنحضرت ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک کو پکڑ کر فرمایا ''اس کا ڈر ہے'' (۳)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد والسیر باب فضل من حمل متاع صاحبہ فی السفر ج ۱ ص ۴۰۴ (۲) ترمذی ابواب الزہد باب حفظ اللسان ج ۱ ص ۶۶ (۳) ایضاً۔

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے اور دوسروں کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہؓ کرامؓ میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہی تھا کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ان کو اپنے گھر دئے، باغ دئے، کھیت دئے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا (۱) اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا، پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت ﷺ نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی، تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور ان کی مدح و ستائش کی (۲):

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (حشر:۵۹-۹)

اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مہاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں اس سے جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مہاجروں) کو دئے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے او پر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجر بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار کے جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں، ان ایثار کے پیکروں نے عرض کی، جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی

(۱) صحیح بخاری اول مناقب انصار ج اص ۵۳۳ وما بعد (۲) تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری پارہ ۲۸ جلد ۲۸ صفحہ ۲۷۔

اتنا ہی نہ ملے ہم کو یہ منظور نہیں، فرمایا اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تم کو نہیں پوچھیں گے (۱)، ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی، آپ ﷺ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کرلیا، اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ یہ مجھے عنایت ہو، آپ ﷺ نے اسی وقت اتار کر ان کے حوالے کر دی، صحابہؓ نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی حاجت تھی اور آپ ﷺ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے، تم نے کیوں مانگ لی، بولے ہاں میں نے تو برکت کے لئے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے (۲)۔

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا، کاشانۂ نبوی ﷺ میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا، جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا خدا تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا، یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے، اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں، صرف بچوں کا کھانا ہے، بولے بچوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو، ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے، البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، صبح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا خدا تعالیٰ تمہارے اس حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا (۳)۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے، اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے (۴)، لیکن قرآن پاک کا سیاق وسباق عموم کو چاہتا ہے، جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

☆

---

(۱) صحیح بخاری کتاب المناقب اول باب مناقب انصار ج۱ص۵۳۵ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا ج۲ص۸۹۱ وکتاب الجنائز باب من استعد الکفن ج۱ص۱۷۰ (۳) صحیح مسلم کتاب الاشربة باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ ج۲ص۱۹۸ وصحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورہ حشر ج۲ص۷۲۶ (۴) ایضاً۔

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے، جس میں وہ منفرد ہے، اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلوں میں افراط وتفریط کے بیچ سے نکلا ہے، قرآن پاک نے مسلمانوں کو اُمَّۃً وَّسَطًا (بقرہ:۲-۱۴۳) (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط وتفریط کے درمیان ہے(۱)، اس لئے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔

دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا. (بنی اسرائیل:۱۷-۱۱۰) اور تو نہ پکار اپنی دعا (یا نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے یا مخالف اس کو سن کر برا بھلا کہے اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔

ہماری چال ڈھال کیسی ہو، اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح میں ہے:

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (لقمان:۳۱-۱۹) اور چل بیچ کی چال۔

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زاہدوں کی نمائشی چال بن جائے (۲)۔

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں، سارے مذہبوں نے اس کی تاکید پر تاکید کی ہے، اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آجائے اور محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے، فرمایا:

---

(۱) تفسیر کبیر فخر رازی تفسیر آیت مذکور (بقرہ) ج ۱ ص ۵۳۲ (۲) دیکھو ابن جریر طبری تفسیر سورہ لقمان پارہ ۲۱ جزء ۲۱ صفحہ ۴۴ وروح المعانی تفسیر سورہ لقمان پارہ ۲۱ جز ۲۱ صفحہ ۸۱۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۱۷-۲۹)

اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (فرقان: ۲۵-۶۷)

اور جو خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں اور ہو اس کے درمیان اعتدال سے۔

یعنی نہ اسراف ہو، نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اکلفوا من الاعمال ماتطیقون

اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کرسکو۔

''عمل'' کا لفظ گو یہاں عام ہے، مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز و روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں (۱)، مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو، اور آخر دم تک نبھا سکو، دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے، مسند بزار میں حضرت حذیفہؓ صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (۲):

مااحسن القصد فی الغنی مااحسن القصد فی الفقر مااحسن القصد فی العبادۃ

دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کہ انسان قارونِ وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے، نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے، لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان وشکوہ، عز وجاہ، اور عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر دنی اور مبتذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھودیتے ہیں اور یہ بھی بے اعتدالی ہے، ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصد والمداومۃ علی العمل ج۲ ص۹۵۷ و فتح الباری ج۱۱ ص۲۵۶۔

(۲) بروایت کنز العمال جلد ثانی صفحہ ۷ حیدر آباد دکن۔

حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہئے، نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گرجانا چاہئے۔

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں، اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے، حضرت عثمان بن مظعونؓ کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گذر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔

خودداری یا عزتِ نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے، زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے اوڑھنے پہننے، غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں یہ وصف نہ ہوگا اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی، نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذاتِ الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بہتر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عزیز لیا گیا ہے، عزیز کے معنی ہیں عزت والا (۱) اور غالب کہیں کہیں عزیز کے ساتھ قوی (قوت والا) یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لئے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے جو اس کے وسیلے سے حاصل ہو، اسلام جب کمزور تھا، تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور ادھر کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلب گار تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا:

اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَھُمُ الۡعِزَّۃَ فَاِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا (نساء:۴-۱۳۹)	کیا یہ ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے:

(۱) عــزۃ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عزّ، شرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے، اس لئے ہر جگہ اس کے وہ معنی لئے جائیں گے، جو سیاق و سباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے: کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے، (دیکھو لسان العرب ج ۲ ص ۶۴ ۷ و مفردات راغب اصفہانی ص ۳۳۶ وابن جریر طبری آیات عزت و سورہ بقرہ و نساء و ص و منافقون۔

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ جَمِیْعًا — جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔

(فاطر: ۳۵-۱۰)

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ — (اے خدا) تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔

(آل عمران: ۳-۲۶)

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معززان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد رسول اللہ ﷺ کو نکال دیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا(۱):

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ. (منافقون: ۶۳-۸) — اور عزت تو اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے ہے، اور ایمان والوں کے لئے، لیکن منافق نہیں جانتے۔

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی، اس لئے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہئے اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہئے اور اسی لئے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہئے، تعلیم محمدی ﷺ کے اثر سے صحابہؓ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت ﷺ نے منظور فرمالیا تھا اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں، ارشاد ہوا بے شک ایسا ہی ہے، عرض کی تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں (۲)، ارشاد ہوا میں خدا کا رسول ہوں، اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا، حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی رسول خدا ﷺ کی نظر اس کے بہت آگے تھی اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوۂ خندق میں آنحضرت ﷺ نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لئے قبیلۂ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ ہر سال دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصارؓ کے سرداروں کو بلا کر آپ ﷺ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی:

(۱) صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ المنافقون ج۲ ص۷۲۹ (۲) صحیح بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد ج۱ ص۳۸۰۔

''یارسول اللہ ﷺ جب ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے، تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور ﷺ کے بہ دولت ہم عزت پا چکے ہیں ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم ہمیں اس معاہدے کی ضرورت نہیں (۱)''۔

صحابۂ کرامؓ جب خلافت کے زمانے میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے، ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا، مسلمان جب تک مسلمان رہے، یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بہ حیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ بہ حیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز آتی رہتی ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی سربراہی) کے لئے
(آل عمران: ۳-۱۱۰)	ظہور میں لائی گئی۔

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے، فرمایا غرور نہیں خودداری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون: ۶۳-۸) ایک مسلمان صالحہ بی بی کے کپڑے پرانے تھے تو بولیں کیا میں مسلمان نہیں یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابوحفص سہروردی کہتے ہیں کہ خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے، کیوں کہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہیں (۲)۔

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام الخندق وقریظۃ والنظیر ج ۲ ص ۱۶۱ و تاریخ طبری ذکر واقعہ احزاب بہ سند ج ۳ ص ۱۴۷۴ (۲) یہ اقوال امام رازی تفسیر کبیر تفسیر سورۃ المنافقون ج ۶ ص ۲۹۷، ۲۹۸ اور صاحب روح المعانی جز ۲۸ پارہ ۲۸ صفحہ ۱۰۲ نے سورۂ منافقون کی آیت وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ (منافقون: ۶۳-۸) میں لکھے ہیں۔

یہ خودداری عین شرافت ہے، جس میں یہ خودداری نہیں، لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں، اس وقار اور خودداری کے لئے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگزر کرنا پڑتا ہے، قرآن میں سچے مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے:

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ اور جب وہ ہو نکلیں بے ہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔ (فرقان: ۲۵-۷۲)

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گزر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاقی خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو، لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھا پن یا تنگ ظرفی یا غرور ونمایش کی بوتک نہ آئے، یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جز شامل نہ ہو، یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمایش میں فرق وامتیاز کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے، مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں، ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے (۱)۔

اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیوں کہ گندہ آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا کیا کپڑے دھونے کے لئے اس کو پانی میسر نہ تھا، ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا فرمایا تمہارے پاس کچھ مال ہے، اس نے کہا اونٹ، بکری، گھوڑے، غلام، سب کچھ ہیں، ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل واحسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہئے (۲)۔

---

(۱) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی الکبر ج۲ص۲۰ (۲) ابوداؤد کتاب اللباس باب فی الخلقان وفی غسل الثوب ص۵۶۲۔

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے، اسی لئے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہوسکتی ہے، لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اذا سمعتم الاقامة فامشوا الى الصلاة وعليكم بالسكينة والوقار ولا تسرعوا (۱)

جب تم اقامت سنو تو نماز کے لئے سکون اور وقار کے ساتھ چلو، جلدی نہ کرو۔

لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، آہستہ چلنا، نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، ابوداؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے:

الهدى الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمسة وعشرين جزء من النبوة

نیک طور طریق نیک انداز اور میانہ روی نبوت کے پچیس اجزا میں سے ایک جز ہے۔

(ص ۶۵۹)

کیوں کہ ان ہی اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان خوبیوں کے بہ دولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ ''دَلّ'' کا ہے اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار، گفتار، شکل وصورت، وضع ولباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور وطریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے، سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا ''وقار'' بولے ''خدوندا میرے وقار کو اور بڑھا'' (۲)۔

فقر وفاقہ کی حالت، یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا

---

(۱) بخاری کتاب الصلوٰۃ باب لایسعی الی الصلوٰۃ ولیاتھا بالسکینۃ والوقار (۲) ادب المفرد باب الختان للکبیر ص ۲۳۰۔

نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابل ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے اصحابِ صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بقرہ:۲-۲۷۳)

(خیرات تو) ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر رے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے، بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

اس آیت میں فقر وفاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے، صاحبِ کشاف نے لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''وہ سوال تو کرتے ہیں، لیکن لجاجت واصرار کے ساتھ نہیں کرتے، بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں'' (۱) لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیوں کہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں ان کو دولت مند سمجھتے ہیں، تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی؟ اصحابِ صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لئے سوال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے، جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے، لیکن اپنی حاجت سے فقر وفاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کی یہی خاموشی لجاجت واصرار کا سوال ہے، کیوں کہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو اس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس لئے یہ حالت خود لجاجت واصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحابِ صفہ لوگوں سے لجاجت واصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے، لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے، جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے، بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں

(۱) تفسیر سورہ بقرہ ج ا ص ۱۷۹۔

ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے (۱)۔

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا''، یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوادی تھی، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا، آپ نے دے دیا، پھر سوال کیا اور آپ ﷺ نے پھر دیا، لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ ''میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا، جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے، خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا''۔

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے، اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے، خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعہ سے''۔

روز مرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے، لیکن کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھا دو، میز پر کتاب رکھ دو، تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا، اسی لئے کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی:

لاتسالوا النّاس شیئاً

تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا۔

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا گر جاتا تھا تو

(۱) تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶، ۵۲۷۔

بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے پہلے تو اس کی اجازت ہی نہیں دی، پھر فرمایا کہ ''اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو'' (۱)، صالحین کی تخصیص غالباً اسی لئے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے، ورنہ رفق وملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لئے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور بہ حیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لئے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لئے ہے اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لئے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے اور اسی فیضِ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ ''مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو''۔ گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لئے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہئے۔

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں، جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک واحتشام، تکلف وتصنع اور جاہ وحشم کی نمایش کا نام نہیں، بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاک ساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اتنا اونچا کردے کہ اگر وہ غریب ومفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل کے مقابلہ میں سر بلند رہے، اور اگر وہ صاحب امارت وحکومت ہو تو اپنے رعب ودبدبہ کے لئے ظاہری نمایشی چیزوں کے بہ جائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جارہے تھے، جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالارِ اسلام حضرت ابوعبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے، جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے، پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لئے اور

(۱) ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب کراھیة المسئلة وباب فی الاستعفاف ص ۲۳۲، ۲۳۳ میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے اوراسی شان سے اسلام کا فرماں روا رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لئے بڑھا، حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لئے ہیں، اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں، یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنڈ آیا ہے ، حضرت عمرؓ نے کہا اے ابوعبیدہ! اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کرامتِ محمد ﷺ کے لئے عبرت بناتا، ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا(۱)۔

☆

(۱) مستدرک حاکم کتاب الایمان ج۱ص۶۲ علی شرط الصحیحین۔

شجاعت اور بہادری

قدیر (قدرت والا) قادر (، مقتدر، قوی، جبار، (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قاہر (جو ہر کوئی کو دبا دے) غالب اور عزیز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں، جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا تھا کہ چوں کہ ہر قسم کا ظلم وستم اور خوں ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے، اس لئے یہ مٹانے کے قابل ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے، اس لئے تعلیمِ محمدی ﷺ نے بہادری و شجاعت کو سراہا اور اس کے موقعوں کی تعیین کی، کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لئے کام میں لانا چاہئے، کیوں کہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کر سکیں اور نہ اسلام کا مقدس فریضۂ جہاد کامیاب ہو سکے۔

ان مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لڑائیوں میں دادِ مردانگی دیں، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے:

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ	اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں، وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے، اور وہی متقی ہیں۔

(بقرہ:۲-۱۷۷)

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے، کیوں کہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو، وہ زبان سے کہے یا نہ کہے، اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے اور جب وہ ایسا کر گذرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے

اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے، ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے:

يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (انفال:۸-۱۵)

اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ''ایمان والے'' کہہ کر خطاب کیا ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی ''ایمان'' مسلمانون کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے، کیوں کہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا:

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ. (انفال:۸-۱۶)

اور جو ان کو اس دن پیٹھ دے گا، مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو یا کسی (مسلمان) دستہ سے جاملنا ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

یہ تو سلبی تعلیم تھی، یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہئے، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لئے ایجابی حکم دیتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا (انفال:۸-۴۵)

اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔

مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے:

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح:۴۸-۲۹)

وہ کافروں پر زور آور ہیں۔

اَشِدَّاءُ کا ترجمہ اس آیت میں زوآور، زورمند اور قوی دست کیا جاسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقت ور اور قوی دست ہونا ضروری ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ	اوران کے لئے تم سے جو ہو سکے یعنی زور وقوت اور گھوڑے
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ	باندھنا، تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال:۸-۶۰)	اور دوسروں کو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے مرعوب کرو۔

اس ''قوت'' کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامانِ جنگ وقتال سے کی گئی ہے، مثلاً قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی، مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ معناً مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے(۱)، غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان واسلحہ تیار رکھنے اور ان کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہیں اور ان سے معاہدہ کر کے توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جا رہی تھی، متوحش ہو رہے تھے، اس پر وحیِ الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا:

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ.	گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ دیکھ
(انفال:۸-۶)	رہے ہیں۔

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے:

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ	جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف تکر تکر
اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ	دیکھتے ہیں، ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں، جیسے کسی پر
(احزاب:۳۳-۱۹)	موت کی غشی آجائے۔

سورۂ محمد میں ان کی دلی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

فَاِذَا اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ	جب اتری کوئی ثابت سورت اور مذکور ہو اس میں لڑائی
رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ	تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے دیکھے گا کہ تکتے ہیں
نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ.	تیری طرف جیسے تک ٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بے ہوشی
(محمد:۴۷-۲۰)	ہے، سو خرابی ہوا ان کی۔

---

(۱) تفسیر طبری تفسیر سورہ انفال آیت مذکورہ پارہ ۱۰ جزء ۱۰ صفحہ ۱۹۔

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (منافقون: ۶۳-۴)

اور جب تو انہیں دیکھے تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو ان کی بات تو سنے، جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں، جو کوئی چیخ سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں، بلکہ دل کی طاقت سے ہے، جس سے منافق محروم ہیں، دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں، ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے، دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں، مگر چوں کہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں، اس لئے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے پیرووں میں شجاعت و بہادری کا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے، گو اس میں مادی وجسمانی شجاعت سے یکسر اعراض وتغافل نہیں ہے، لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے، اسی لئے اوپر کی آیت میں دیکھئے کہ منافقین کے جسمانی طول وعرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے کہ چوں کہ ان کا یہ دکھاوے کا قالب ایمان اور یقین کی روح سے خالی ہے، اس لئے ان میں شجاعت اور بہادری نہیں، اسی بنا پر وہ اپنے پیرووں میں شجاعت اور بہادری کا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے، جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

۱- جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، اس لئے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں، صرف فضلِ الٰہی اور نصرتِ خداوندی چاہئے۔

۲- ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آجائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

۳- خدا کی راہ میں مارا جانا، زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا میں نہیں مارا گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلت وکثرت: تعداد کی قلت وکثرت پر جدوجہد کی کامیابی وناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے، کامیابی وناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں، بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی واخلاقی کیفیت پر منحصر ہے، تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو، اگر اس میں ایمان ویقین کی قوت موجود ہے تو بہ فضلِ خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پاسکتی ہے، اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھادیا ہے:

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللهِ (بقرہ:۲-۲۴۹)	کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آگیا ہے۔

حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے، اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ (مائدہ:۵-۲۲) ''اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے''، اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں:

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَعَلَى اللهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (مائدہ:۵-۲۳)	تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

بدر اور احد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے،

ارشاد ہوا:

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (انفال:۸-۱۹)	اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا، اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ. (آل عمران:۳-۱۵۹)	تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر، بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں۔

فتح وشکست حکمِ الٰہی پر موقوف ہے، اور مدد اسی طرف سے آتی ہے:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ اِنَّ اللهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (انفال:۸-۱۰)	اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے، بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا، بلکہ اس کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لئے خوش خبری سنادی، فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے، ثابت قدم دس مسلمان سو پر ہیں اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ. (انفال:۸-۶۵)	اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا، اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر (ثابت قدم) ہوں، تو وہ دو سو پر غالب ہوں اور اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں، کیوں کہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کے شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتادی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر وتوکل کی قوت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم وبصیرت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد اس آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کردی گئی، پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی وبہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ کہ ایک مسلمان اپنے سے دوچند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں:

فَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ. (انفال:۸-۶۶)	تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں تو دو سو پر غالب ہوں، اور اگر تم سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بہ حکم خدا غالب ہوں اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمد اللہ مسلمانوں میں پیدا ہے، کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے اور وہ اپنے اس یقین وایمان کی بہ دولت اپنے سے دونی تعداد کی پروا نہیں کرتا اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا رعب بیٹھا ہے، جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے ہے کہ:

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران:۳-۱۵۱)	ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے۔
سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (انفال:۸-۱۲)	میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا، چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے:

وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب:۳۳-۲۶) اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (حشر:۵۹-۲) اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے: انسان کی کمزوری کی اصلی وجہ موت کا ڈر ہے، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے، جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے اور نہ بلائے آ سکتا ہے، اس لئے کسی خطرے کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحیِ محمدی ﷺ نے مسلمانوں کو اس عقیدے کی بار بار تلقین کی ہے، یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے، غزوۂ احد میں مسلمانوں کے پاؤں اٹھ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور اس عقیدہ کو یاد دلایا:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران:۳-۱۴۵) اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے، لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔

جب اللہ کا حکم ہوگا تبھی کوئی مر سکتا ہے، پھر موت سے خوف کیوں ہو اور اس سے بزدلی کیوں چھائے، جنگ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا:

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ (احزاب:۳۳-۱۶) (اے پیغمبران سے) کہہ کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے، سراپا غلط ہے، جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آ کر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا:

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران:۳-۱۵۴) (اے پیغمبران سے) کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو جن کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے۔

یہ سمجھنا کہ چوں کہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لئے مارے گئے یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانوں سے

کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو، جو یہ کہتے ہیں:

لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَ اللّٰهُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ (آل عمران:۳-۱۵۶)

اگر یہ (مرنے یا مارے جانے والے) ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے (اور یہ خیال اس لئے ان کے دل میں آتا ہے) تا کہ اللہ ان کے اس خیال کو ان کی دلی حسرت بنائے اور (واقعہ تو یہ ہی ہے کہ) اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہوں تو ٹال لیں:

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (آل عمران:۳-۱۶۸)

اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو۔

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے ان کے خطرے کا ذکر کر کے ان کی تشفی کی گئی:

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا اَخَّرْتَنَا اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا. اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (نساء:۴-۷۷)

پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگے، جیسے خدا سے ڈر ہو یا اس سے بھی بڑھ کر اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت پرہیز گار کے لئے بہتر ہے اور تمہارا حق ذرہ بھی دبایا نہ جائے گا، جہاں تم ہو گے موت تم کو پالے گی، اگر چہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو، موت سے چھٹکارا نہیں، پھر میدان جنگ سے تم کیوں گھبراؤ، بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو، جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ. (آل عمران:۳-۱۷۳)

وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لئے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے، سو تم ان سے خوف کرو، تو اس نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا اور بول اٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔

شہادت اور غزا کا رتبہ: میدان جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی، وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع وقمع کر دیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلے میں بکا ہوا ہے اور وہاں ان کے لئے وہ کچھ مہیا ہے، جس کے سامنے یہاں کا بڑا سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ (توبہ:۹-۱۱۱)

اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لئے جنت ہے، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے سورہ نساء میں اہلِ ایمان کو جو آخرت کے لئے دنیا کا سودا کر چکے ہیں، اعلان ہے:

فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ ؕ وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا. (نساء:۴-۷۴)

تو جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑے، پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے:

فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ (آل عمران:۳-۱۹۵)

تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، اتاروں گا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو جنت میں۔

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ ان کی زندگی تھی، وہ ان کو ازسرِ نو اسی وقت دے دی جائے گی، اس عقیدے کی تعلیم نے اس خیالِ باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں، ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہیں:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ. فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ (آل عمران:۳-۱۶۹)

اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں، خدا نے ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔

ان کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے، پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہئے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۵۴)	اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں گے، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں بلکہ تم کو اس کی خبر نہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات انہی کے لئے ہیں جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لئے لڑتے ہیں، اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض وغایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ وغضب اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی ہے، اگر کوئی مال کے لئے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی، فرمایا:

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا (نساء:۴-۹۴)	چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال سو اللہ کے پاس بڑا مال غنیمت ہے، تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے، تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔

رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمائش کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ وانتقام کے لئے لڑتا ہے تو آپ ﷺ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا:

من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ اعلیٰ فھو فی سبیل اللّٰہ (۱)	جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لئے لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اس لئے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ (۲) سو تم اپنا اجر پا چکے اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا چکا“

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ ھی العلیا ج ۲ ص ۱۳۹ و صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللّٰہ ج ۱ ص ۳۹۴ (۲) صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعة استحق النار ج ۲ ص ۱۳۹ و جامع ترمذی ابواب فضائل الجہاد باب من قاتل ریاء وللدنیا ج ۲ ص ۲۹۴۔

غرض جس شجاعت کا مقصودِ اصلی ریا و نمایش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے، لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے(۱)، کیوں کہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، خدا جس ناز تبختر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترآئے (۲)، کیوں کہ اس سے دشمنوں پر رعب وداب قائم ہوتا ہے اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے، ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجے میں کہا، ''لو میں ابن اکوع ہوں''، حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں:

''یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے، کیوں کہ حالت کا اقتضا یہی تھا، اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے جو لڑائی میں جائز ہے اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں'' (۳)۔

غزوۂ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیا تو آپ ﷺ نے خود عزم و ثبات کے عربی لہجے میں فرمایا:

انا النبی لاکذب انا ابن عبد المطلب — میں پیغمبر ہوں جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں اس لئے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا، چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی (۴)۔

صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت ﷺ کے پاس کھڑا ہوتا تھا (۵) وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہایت بہادر تھے، ایک بار اہلِ مدینہ کے دلوں میں کسی حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا وہ خود سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ تھے، آپ ﷺ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آکر فرمایا، ''خوف کی کوئی بات

(۱) فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۲ شرح حدیث مذکور (۲) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب ص ۳۶۰ (۳) فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۱۴ (۴) صحیح بخاری کتاب المغازی غزوۃ حنین ج ۲ ص ۶۱۷ و کتاب الجہاد باب بغلۃ النبی ﷺ ج ۱ ص ۴۰۲ (۵) صحیح مسلم کتاب الجہاد و السیر باب فی غزوۃ حنین ج ۲ ص ۸۲۔

نہیں"(۱) ایک موقع پر جب بدویوں نے آپ ﷺ کو عطیہ کے لئے گھیر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم لوگ مجھ کو بخیل جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے"(۲) بزدلی اسلام میں ایسا سخت اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے ان میں بزدلی بھی ہے، چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بے چارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بے چارگی کی ایک قسم ہے، پناہ مانگتے تھے، دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے(۳)، ایک روایت میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے(۴)۔

حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفی صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا، اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو(۵)، اسی خط میں آنحضرت ﷺ کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے:

واعلموا ان الجنة تحت ظلام السيوف (۶) یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجهاد باب الحمائل وتعليق السيف بالعنق ج۱ص۴۰۷ (۲) بخاری کتاب الجهاد باب الشجاعة في الحرب والجبن ج۱ص۳۹۵ (۳) بخاری کتاب الجهاد باب مايتعوذ من الجبن ج۱ص۳۹۶ (۴) ابوداؤد کتاب الجهاد باب في الجرأة والجبن ص۳۴۰ (۵) صحیح بخاری کتاب الجهاد باب الصبر عند القتال ج۱ص۳۹۷ (۶) ایضاً باب الجنة تحت بارقة السيوف ج۱ص۳۹۵ وباب ما كان النبي ﷺ اذا لم يقاتل اول النهار اخر القتال ج۱ص۴۱۶۔

استقامت

''استقامت'' کے لفظی معنی ''سیدھا رہنے'' یا ''سیدھا چلے چلنے'' کے ہیں اوراس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرے کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اوراس راستے پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا چلا جائے۔

آنحضرت ﷺ کواس اعلان کا حکم ہوتا ہے کہ:

اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (حٰمٓ السجدہ:۴۱-۶)	تمہارا معبود ایک ہی ہے، سواس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لئے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو، اس سے کسی حال میں ادھرادھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو، ایک اورآیت میں بارگاہِ الٰہی سے جناب رسالت مآب ﷺ اورآپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ راہ سے بہکو، نہ حکم ماننے سے سرکشی ہو:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. (ھود:۱۱-۱۱۲)	تو (اے پیغمبر) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوااور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو، کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

عرب کا گرم ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ وغضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا ہے، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسولِ حق کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے، اس موقع پر رسولِ اسلام اورآپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلانِ حق اورحق پر استقامت کی تاکید پر تاکید ہورہی ہے، ارشاد ہوتا ہے، اسی دینِ حق کی طرف سب کو بلاتے رہو اور ثابت قدمی دکھاؤ اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ	پس اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرمادیا اوران

اَھْوَآئَھُمْ (شوریٰ:۴۲-۱۵) کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف وخطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوش خبری سنائی جارہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لئے ہے، وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ. (احقاف:۴۶-۱۳)

بے شک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ (اس پر) جمے رہے، تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے، ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا وہاں تسکین وتسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. (حٰمٓ السجدہ:۴۱-۳۰)

بے شک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر جمے رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم سے وعدہ تھا۔

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابیؓ دریافت کرتے ہیں کہ ”یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے کہ میں اس سے چمٹ جاؤں، ارشاد ہوا کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ“ (۱) صحابہؓ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کئے ساڑھے تیرہ سو برس گذر گئے مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت اور آفریں کی صدائیں بلند ہورہی ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے، فرمایا:

اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا. ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ

جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے،

(۱) ترمذی ابواب الزھد باب ماجاء فی حفظ اللسان ج۲ ص۶۶۔

الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا.

وہاں ایمان والے جانچے گئے اور خوب جھڑ جھڑائے گئے۔

(احزاب:۳۳-۱۰)

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد ہے:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا

(احزاب:۳۳-۲۲)

اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا اور اس کو پورا کر دکھایا، ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا.

(احزاب:۳۳-۲۳)

ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اس میں مردانِ خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی، کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی، فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ.

(بقرہ:۲-۲۱۴)

کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے اگلوں کے احوال نہیں آئے، ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی اور جھڑ جھڑائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، سن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا، اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کئے ہیں، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ. (بقرہ:۲-۲۵۰)

اے ہمارے پروردگار ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤں اور اس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے، احادیث (۱) وسیر میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسیٰؑ کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے، یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر ان کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا، مگر وہ دینِ حق سے برگشتہ نہ ہوئے:

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ. النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ. اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ. وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ. وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ. (بروج:۸۵-۴تا۸)

مارے جائیو کھائیاں کھودنے والے، آگ بھری ایندھن سے، جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے اور وہ ان سے بدلا نہیں لیتے تھے مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے۔

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا، وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے، خبابؓ بن ارت صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لئے دعا کیجئے، چوں کہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دینِ حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا'' (۲)۔

(۱) صحیح مسلم کتاب الزہد باب قصۃ اصحاب الاخدود والسحر والراہب والغلام ج۲ص۵۳۹ وسیرت ابن ہشام قصۂ اصحاب الاخدود (۲) صحیح بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام ج۱ص۵۰۴۔

رسولِ اسلام علیہ السلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ ﷺ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہیں، ان ہی خبابؓ بن ارت کا جو اس روایت کے راوی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے (۱)، حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی، تو تائے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم و ستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَد اَحَد (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا، حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں، مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں، خود آنحضرت ﷺ کا وہ فقرہ جس کو آپ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے جواب میں کہا تھا، اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی، جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے، فرمایا! چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ میں مرجائے، یا مارا جائے، تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہیں، اس کا ساتھ تم اس لئے دیتے ہو کہ وہ حق ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا (آل عمران: ۳-۱۴۴)	اور محمد تو ایک رسول ہے، اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے، پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا، تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر و ثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے:

(۱) ابن سعد ج ۳ تذکرہ خبابؓ بن الارت ص ۱۱۷۔

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ قٰتَلَۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا ‌ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ ۔ وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ.

(آل عمران:۳-۱۴۶)

اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا والے لوگ لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ میں کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثباتِ قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔

اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے، جس کا نام مداومت ہے، یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے، کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان کے سب اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا:

اِلَّا الۡمُصَلِّيۡنَۙ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ.

(معارج:۷۰-۲۲،۲۳)

لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں، (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)۔

اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے اور اس کی مشق مداومتِ عمل سے ہوتی ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عملِ نیک سب سے زیادہ محبوب تھا، فرمایا ''وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے'' (۱)، خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو'' (۲)۔

(۱) و (۲) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصد ومداومۃ العمل ج۲ص ۹۵۷۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح میدانِ جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں، بعینہ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے، اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابلِ ستائش سمجھا جاتا ہے، جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقت ور ہو اور اسلام نے اسی قابلِ ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ. اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ. الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (الحجر:۱۵-۹۴تا۹۶)

پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکین کی مطلق پروانہ کرو، ہم تم کو تمہاری ہنسی اڑانے والوں کے مقابلہ میں جو خدا کے ساتھ دوسرے دوسرے معبود قرار دیتے ہیں، کافی ہیں۔

یعنی اب مخفی طور پر دعوتِ توحید کا زمانہ گذر گیا اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آ گیا، اس لئے کھلم کھلا خدا کے اس حکم کو بیان کرو اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر و استہزا کی مطلق پروانہ کرو، بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروانہ کرو، سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے وہ خوف ہے، جس کی مختلف قسمیں ہیں، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے، جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے:

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (مائدہ:۵-۵۴)

اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

یعنی اہلِ ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پروانہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا ''کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہئے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو''، ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے، صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیوں کر حقیر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے، ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف، ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہئے تھا۔

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے، اس لئے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ ﷺ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر — بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔

دوسری روایت میں ''کلمۃ حق'' کا لفظ ہے۔

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دئے گئے ہیں ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے، چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا حالاں کہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا، حالاں کہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ ''تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے، ورنہ زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے''(۱)۔

صحابہؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا مرتبہ حق گوئی میں بہ درجۂ کمال تھا، یہ وہی تھے، جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا،

(۱) سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر ص ۲۹۸ و مابعد میں یہ تمام حدیثیں مذکور ہیں۔

اوراس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بے دم نہ ہو گئے لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترا اور دوسرے دن پھر جا کر اعلان حق کیا اور وہی سزا پائی، آنحضرت ﷺ نے ان کی مدح میں فرمایا کہ ''آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں''(۱)، چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی، اس پر انہوں نے بے محابا دار و گیر کی اور اس میں امیر معاویہؓ کی پروا انہوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں، کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا، جس میں فرمایا ''ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے'' یہ سن کر حضرت ابوسعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آگئے(۲)۔

☆

---

(۱) جامع ترمذی ابواب المناقب مناقب حضرت ابی ذر الغفاریؓ ج۲ص۲۲۰ (۲) کتاب الترغیب والترھیب منذری ج۲ باب الترھیب من الغضب ص۱۶۲ بحوالہ ترمذی۔

استغنا

استغنا کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف خداوند تعالیٰ ہی کو حاصل ہے:

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ. (آل عمران:۳-۹۷) اور جو (مقدور رکھے پیچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔

اور اس بے نیازی میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے:

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد:۴۷-۳۸) اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے، اسلام کے آئینِ اخلاق میں اس استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے، اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے، اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے، قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے ہیں، اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ. (فاتحہ:۱-۵) (اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

خدا نے جا بجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے، فرمایا:

وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ. (آل عمران:۳-۱۷۳) اور کیسا اچھا کارساز۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا. (اسرائیل:۱۷-۶۵) اور تیرا رب کارساز بس ہے۔

أَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا. (بنی اسرائیل:۱۷-۲) میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا. (نساء:۴-۸۱) اور اللہ کارساز بس ہے۔

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (زمر:۳۹-۳۶) ''کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں''

اس لئے کسی شاہ، امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغنا کی بنیاد ہے وہ قناعت ہے، یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے، اس پر طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (نساء:۴-۳۲) اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی، اس کی ہوس مت کرو۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (طٰہٰ:۲۰-۱۳۱) اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال و دولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں، اس لئے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا، تاہم خدا نے جو کچھ اس کو دیا ہے، اس پر قانع رہتا ہے اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا، اس لئے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے، اس بنا پر استغنا و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے اور اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

ليس الغنى عن كثرة العروض ولكن الغنى غنى النفس دولت مندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔

(بخاری، رقاق، باب الغنی غنی النفس ج ۲ ص ۹۵۴)

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدیؒ نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

''تونگری بہ دل است نہ بہ مال''

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ ﷺ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا، حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابوذر! تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا ''ہاں'' فرمایا تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ میں نے

کہا ’’ہاں‘‘ فرمایا ’’بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی‘‘ (۱)، اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی، یعنی خدا انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے، یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے (۲)، ایک بار چند انصاریوں نے آپ سے مال کا سوال کیا اور آپ ﷺ نے ان کا سوال پورا کیا لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا اور آپ ﷺ نے پھر ان کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا، جو شخص خودداری چاہتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے (۳)، اسی طرح ایک بار حکیم بن حزامؓ نے آپ ﷺ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ ﷺ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا لیکن اخیر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے، خدا اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا، ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہیں قبول کیا (۴)۔

فضالہؓ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوش خبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے (۵)، حضرت سہلؓ بن سعد کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کا عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے (۶)۔

---

(۱) فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للهیثمی قلمی نسخہ دار المصنفین باب الغنی غنی النفس ص ۵۸۸ (۲) فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۴ (۳) ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی الاستعفاف ص ۲۳۲ (۴) ترمذی ابواب الزھد ابواب صفۃ القیامۃ ج ۲ ص ۷۳ (۵) زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القناعۃ ص ۵۹۵ (۶) مستدرک حاکم کتاب الرقاق ج ۴ ص ۳۵۲۔

رذائل

رذائل کے معنی: رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاقِ ذمیمہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہ گار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقل مند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بہ دولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں، یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام: اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً اکثر ان کو مُنکَر (ناشناسا) اور فَحشَآء (بے حیائی) اور کبھی فَاحِشَة (فحش) سَيِّئَةٌ (برا) سُوْء (برائی) مَكْرُوْه (ناپسندیدہ) خَطَأٌ (ناصواب یا بھول) اِثْمٌ (گناہ) عُدْوَانٌ (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے، ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں فرمایا:

وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا. وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا.

(بنی اسرائیل: ۱۷-۳۱و۳۲)

اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مار ڈالو، ہم ہیں ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے، بے شبہ ان کا مار ڈالنا بڑی چوک ہے اور زنا کے پاس مت جاؤ، بے شبہ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا . كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا.

(بنی اسرائیل: ۱۷-۳۶،۳۷)

اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑ کو پہنچ جائے گا، ان میں سے جو بری بات ہے وہ تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

رذائل کے لئے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ مُنْکَر ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں جن برائیوں

کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے، ان کو ایک ہی لفظ منکر سے ادا کیا گیا ہے:

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ. (مائدہ:۵-۷۹) — وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے، کیا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔

ایک بدکار قوم کی برائیاں گنائی جارہی ہیں اس سلسلہ میں ہے:

وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ (عنکبوت:۲۹-۲۹) — اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب ہوتے ہو۔

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے:

وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ (توبہ:۹-۱۱۲) — اور منکر سے منع کرنے والے۔

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران:۳-۱۰۴ و توبہ:۹-۷۱) — اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

اور کہیں فحشآء اور منکر کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے:

فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (نور:۲۴-۲۱) — وہ فحشا اور منکر کرنے کو کہتا ہے۔

نماز کی خوبی یہ ہے کہ:

تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (عنکبوت:۲۹-۴۵) — وہ فحشا اور منکر سے باز رکھتی ہے۔

فحشا منکر اور بغی: کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں فحشا منکر اور بغی:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ. (نحل:۱۶-۹۰) — (مسلمانو!) اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے، اور فحشا اور منکر اور بغی سے منع فرماتا ہے، تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ ﷺ کی شرم وحیا سے اسلام لایا تھا، اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑلی (۱)۔

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر وشر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے (۲)۔

---

(۱) مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ ج ۱ ص ۳۱۸ (۲) مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۵۶ و ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور پارہ ۱۴ جزء ۱۴ ص ۱۰۰۔

قتادہؒ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جن اخلاقِ حسنہ پر عمل کیا جاتا تھااور وہ پسند کئے جاتے تھے،ان میں کوئی خلق ایسا نہیں ہے جس کا خدا نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہواور کوئی بداخلاقی ایسی نہیں ہے جس کی اس آیت میں ممانعت نہ کی ہو(۱)۔

اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں فَحشَاء اور مُنکَر اور بَغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فَحشاء کے معنی: ان میں پہلا لفظ فَحشَاء ہے جس کی دوسری صورت فَاحِشَۃٌ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں (۲) اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبیح یعنی برائی کے ہیں، کیوں کہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کردی ہے اس سے آگے بڑھنا قبیح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشا کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرمادیں، اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدیِ حدود اور فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا:

وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ. فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ. (مومنون: ۲۳-۵تا۷)

اور جو اپنی شرم گاہوں کی نگہ بانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر تو انہیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کو ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

اس لئے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امرِ قبیح کے ہوگئے ہیں، قرآن نے کہا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِیْلًا. (بنی اسرائیل: ۱۷-۳۲)

اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیوں کہ یہ "فاحشہ" (یعنی قبیح بات) اور بری راہ ہے۔

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

---

(۱) ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور پارہ ۱۴ جز ۱۴ ص ۱۰۰ (۲) الصحاح للجوھری لفظ "فحش" ولسان العرب لفظ "فاحش" زیر "فحش"، ج ۲ ص ۱۰۵۶۔

مُنکَر کے معنی: دوسرا لفظ مُنکَر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے، اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اس لئے اس کو معروف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ منکر (ناشناسا) ہے، حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں، قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (حجر:۱۵-۶۲ وذاریات:۵۱-۲۵) یعنی لوگ ان جانے اور ان پہچانے ہیں، حضرت یوسفؑ کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انہوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے، اس موقعہ پر قرآن میں ہے فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (یوسف:۱۲-۵۸) یعنی ''یوسف نے تو ان کو پہچان لیا مگر وہ ان کو پہچان نہ سکے''۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بداہتاً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے یہ کیفیت بھی منکر ہے، فرمایا:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا (حج:۲۲-۷۲)

اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جائیں تو کافروں کے چہروں میں تو منکر (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا، نزدیک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں حملہ کر بیٹھیں۔

اس آیت میں ناخوش گواری کے اثر سے چہرے میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے اس کو منکر کہا گیا ہے، ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں، جن کو ہر شخص فطرتاً اور بداہتاً ناپسند کرتا ہے اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب اور ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی: تیسرا لفظ بَغی ہے، جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں:

خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ (ص:۳۸-۲۲) ہم دو جھگڑنے والے ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ (شوریٰ:۴۲-۲۷)

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔

اسی سورہ میں ہے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (شوریٰ:۴۲-۴۲)	راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں۔

اخلاقِ ذمیمہ برے کیوں ہیں: اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحشا، منکر اور بغی میں منحصر ہیں، صفاتِ ذمیمہ فحشا یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرتاً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کر دینے سے دوسروں کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورہ اعراف کی ایک آیت ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (اعراف:۷-۳۳)	اے پیغمبر کہہ دے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے، ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی، ان اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے، اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے(۱)۔

رذائل کی ترتیب: ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے، ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدمِ رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے، اوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے فحشا پھر منکر، پھر بغی۔

(۱) منطقی اصطلاح میں فحشاء، منکر اور بغی میں مانعۃ الخلو ہے یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہوسکتا ہے مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی، یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

فحشا میں جس برائی کی طرف اشارہ وہ اساسا ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگے رہنا، بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ، منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگ دلی، اولاد کی نالائقی اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھا لیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی، دوسرے نظریہ کی رو سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہیں جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وہ برائیاں ہیں جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے، یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے، یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیوں کہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کے ضد ہے، اس لئے یہ برائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہیں جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا یا باور کرسکتا ہے، تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے، اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا، بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے، تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے، کیوں کہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبروں کے لئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ (مریم:۱۹-۵۶)

اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر، وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا۔

اسی لئے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہوسکتا، کیوں کہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیوں کر ہوگا، حضرت موسیٰؑ نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا، فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے صدقِ نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی نہیں ہوسکتا:

اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ۔ (مومن:۴۰-۲۸)

اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے اور اگر سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے، بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کرگذرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے، انبیا علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور وطریق پر چلتے ہیں، روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا، ابوسفیان نے جواب دیا نہیں، قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر جھوٹ باندھے گا؟ (۱) یہ نہیں ہوسکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے:

تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ. يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ. (شعراء: ۲۶-۲۲۲، ۲۲۳)

شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہ گار پر، لا ڈالتے ہیں سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے، اسی لئے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے، ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ. (زمر: ۳۹-۳)

بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے، احسان نہیں مانتا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے" (۲)، حضرت عبداللہؓ بن عمرو ابن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو نیکی کا کام کرتا ہے وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا، اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا" (۳)۔

---

(۱) صحیح بخاری بدء الوحی ج ۱ ص ۴ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ج ۲ ص ۹۰۰ و جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الصدق والکذب ج ۲ ص ۱۸ و ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب ص ۶۸۱ (۳) مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۶ مصر۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آ جاتا ہے، جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں اور جس کے لئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے، مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایے سے وہ باہر ہے، جس کا منہ جھوٹ کی بادِ سموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ ''لعنت'' ہے، لعنت کے معنی ''اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی'' کے ہیں، قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بنایا گیا ہے اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا، جھوٹ بولنے اور جھوٹ الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے، مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو:

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ. پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

(آل عمران: ۳-۶۱)

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا:

اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ. اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔

(نور: ۲۴-۷)

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بددعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی ان جان بن جائے، حق کا علم رکھ کر بھی اس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹے پر بھی لعنت فرمائی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان، اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو

اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ۔ انسانوں کے لئے کھول کر کہہ دیا ہے، ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے، اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

(بقرہ:۲-۱۵۹)

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے کیوں کہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لئے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لئے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا، چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا:

وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

(منافقون:۶۳-۱)

اس لئے آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے، فرمایا کہ ”منافق کی پہچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے“(۱) لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے، کیوں کہ جو امین بنتا ہے وہ معناً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔

جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے:

اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ۔ (شعراء:۲۶-۲۲۲) جھوٹ بولنے والا گنہ گار۔

کٰذِبٌ کَفَّارٌ۔ (زمر:۳۹-۳) جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا۔

مُسْرِفٌ کَذَّابٌ۔ (مومن:۴۰-۲۸) بے باک جھوٹا۔

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے، کیوں کہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ و کونوا مع الصّدقین وماینھی عن الکذب ج۲ ص۹۰۰۔

اس کو چھپالوں گا، اس لئے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا، کیوں کہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس کی بات پر یقین کا ہے کو آنے لگا، اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں، یا جو اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو لیکن یہ کذبِ قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے، کذبِ عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے:

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰہَ مَاوَعَدُوْہُ وَبِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ (توبہ:۹-۷۷)

اس لئے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لئے کہ جھوٹ بولتے تھے۔

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی، قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے:

وَسَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَکُمْ یُھْلِکُوْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ. (توبہ:۹-۴۲)

اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے، جنہوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے، فرمایا:

لِیَجْزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِھِمْ وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ (احزاب ۳۳-۲۴)

تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے، یا ان پر رجوع ہو (یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)۔

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہوسکتا ہے، فرمایا:

نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ. (علق:۹۶-۱۶)

جھوٹی خطا کار پیشانی۔

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہیے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنگ کا ٹیکا ہے، جو مٹ نہیں سکتا۔

اسی طرح ریا کاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے:

قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰکُمْ هُمْ لِلْکُفْرِ یَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّالَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران:۳-۱۶۷)

انہوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہوگی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں، وہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں، وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جوان کے دل میں نہیں۔

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے، اور مسلمانوں کو آ کر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ (نساء:۴-۶۳)

یہ وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے۔

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے جھوٹا ہے، ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے، کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلانا مدِ نظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے، فرمایا "جو جتنا نہیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے" (۱)، حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں، اس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا اور جس نے جو نہیں دیا، اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا، اسی طرح جو عالم نہیں، وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولت مند نہیں وہ دولت مندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا، درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے، غالباً اسی لئے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے، آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی زُور فرمایا ہے (۲)۔

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لئے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے، اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے، ایک کم سن صحابی عبداللہ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور ﷺ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے،

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی من یتشبع بمالم یعط ص ۶۸۲ (۲) صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر ج ۲ ص ۸۷۹۔

توماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ ''یہاں آؤ تجھے کچھ دوں گی''، حضور ﷺ نے فرمایا تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو، ماں نے کہا اس کو کھجور دے دوں گی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں، اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا'' (۱)۔

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہئے لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لئے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویہ سے بچہ کی تعلیم وتربیت پر برا اثر پڑے گا، وہ بچپن میں جو کچھ دیکھے اور سنے گا اسی سانچے میں ڈھلے گا، اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لئے یا کسی اور چیز کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالاں کہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے، تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماءؓ بنت یزید نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں، تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا، ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے (۲)۔

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے بھی اگر چہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دل چسپی کی چیز بن جاتا ہے، تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے، اس پر افسوس، اس پر افسوس'' (۳) کیوں کہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کئے ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے، اس لئے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے لیکن وہ شخص اس کے علم ویقین سے ناجائز فائدہ

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب ص ۶۸۱ (۲) مسند احمد وطبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی ج ا ص ۱۴۰ باب فی ذم الکذب) (۳) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب ص ۶۸۱۔

اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب ونقصان میں مبتلا کر دیتا ہے، اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو، درآں حالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو" (۱)۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت وآبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زُور اور اِفک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ. (حج:۲۲-۳۰)	بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔

زور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب وبہتان وغیرہ سب شامل ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے کہا "ہاں یا رسول اللہ ﷺ" فرمایا کہ "شرک اور باپ ماں کی نافرمانی"، راوی کا بیان ہے کہ آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، کہ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ "جھوٹی شہادت" یا "جھوٹی بات" اور برابر یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہوجاتے (۲)۔

اس آیتِ پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔

افک اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا، مشرک خدا پر جھوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے افک کہا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی

(۱) ادب المفرد باب اذا کذبت لرجل ھولک مصدق ص ۷۸ (۲) ابواب البر والصلة باب ماجاء فی عقوق الوالدین ج ۲ ص ۱۲۔

شرک سے مل جاتی ہے، منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ ''افک'' سے تعبیر کیا ہے (نور: ۲۴-۱۲) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''افک'' بڑے خبثِ طینت کا کام ہے، فرمایا:

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ. (شعراء: ۲۶-۲۲۲) اور شیطان تو اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے پر بدکردار پر۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے، ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں اس کی بات کی قدر نہیں ہوتی، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع (مقدمہ صحیح مسلم باب النہی عن الحدیث بکل ماسمع ص ٦) آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے، یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (مائدہ: ۵-۴۲) جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے، جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے، وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے، ایسی حالت میں خیال کرنا چاہئے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں، وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے، اس لئے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لئے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت نفس قسم کھانا ہی برا ہے، پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس قسم کے قسم کھانے اور قسم کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے، جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے، اسی لئے کسی آیندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ گنہ گار ہوتا ہے اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے، کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے، یا دس مسکینوں کو کھانے کھلائے، یا کپڑے پہنائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ کسی کو قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کردے (۱):

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (مائدہ:۵-۸۹)	اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا، لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے گرہ باندھا، تو اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دس محتاجوں کو کھلانا بیچ کا کھانا، جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا، یا ایک غلام آزاد کرنا، تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ رکھنا، یہ ہے تمہاری قسموں کا اتار، جب تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔

(۱) ابوداؤد کتاب الایمان والنذور باب الحنث اذا کان خیرا ج ۲ ص ۴۶۵۔

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلاف شرع، یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے، یہ کفارہ اسی لئے مقرر کیا گیا ہے تا کہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

کسی خلاف شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے بعد کو غیر انسب معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، خدا نے فرمایا:

قَدْفَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ (تحریم:۶۶-۲)	خدا نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں۔

گذشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے، اسی لئے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے حد درجہ بے اعتبار اور نا قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (قلم:۶۸-۱۰)	اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا مان۔

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس کا اعتبار کریں لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

چوں کہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں اسی لئے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقوں کے تذکرے میں ہے کہ جب ان پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ منشا نہ تھا، ہماری نیت نیک تھی، خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے:

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا. اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ (نساء:۴-۶۲، ۶۳)	پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف پہنچے پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی یہ وہ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے، ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں، خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو تو ان کو چاہئے کہ سچائی اختیار کر کے خدا اور رسول کو خوش کریں:

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ. (توبہ:۹-۶۲)	تمہارے (مسلمانوں کے) آگے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تا کہ وہ تم کو راضی کر لیں اور اللہ اور رسول کو راضی کرنا زیادہ ضروری ہے اگر وہ ایمان دار ہیں۔

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں:

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ (توبہ:۹-۷۴)	خدا کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا، حالاں کہ انہوں نے بے شک کفر کی بات کہی۔

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا، خدا نے فرمایا کہ جب تم جا کر ان سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائیں گے سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ (توبہ:۹-۹۵) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ. (توبہ:۹-۹۶)	تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔

اس لئے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں، وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی، خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا:

وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ. (توبہ:۹-۱۰۷)	اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اہلِ نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے:

وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ (مجادلہ: ۵۸-۱۴)

اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔

اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (مجادلہ: ۵۸-۱۶، منافقون: ۶۳-۲)

انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ اور اس کو اپنے بچاؤ کے لئے ڈھال بنایا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی:

وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ. وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا ۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (نحل: ۱۶-۹۱و۹۲)

اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو اور تم نے اپنے پر خدا کو ضامن بنایا ہے، بے شک اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے اور اس عورت کے جیسے نہ بنو، جو اپنے کاتے سوت کو محنت کئے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی، تم اپنی قسموں کو آپس میں پیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے، اس لئے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا، اس لئے قسم کھا کر توڑا نہ کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو، پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بے وقوف عورت کا تھا، جو سوت کات کات کر کھول دیتی یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقت ور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے اور یہ ایک کے بہ جائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے، یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا

بے شک جو لوگ خدا کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، نہ اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف

يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. دیکھے گا قیامت میں اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

(آل عمران:۳-۷۷)

شانِ نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے، مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہر حال عام ہے، ایک دفعہ حضرت عبداللہؓ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ خدا کے پاس جائے گا تو خدا اس پر غضب ناک ہوگا'' اشعثؓ بن قیس صحابی نے کہا ''خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعے میں اتری ہے، میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا، حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ ﷺ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ وہ تو اب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لے گا، اس وقت یہ آیت اتری'' (۱)۔

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا ''تین آدمی ہیں جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''، صحابی کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ لوگ جو ناکام ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے وہ کون ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا، جو اپنا لباس (ٹخنوں کے نیچے تک) لٹکاتا ہے، (کیوں کہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے (۲) بہر حال جیسا کہ معلوم ہے کہ شانِ نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے اس لئے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الایمان والنذور باب فی من حلف لیقطع بھا مالا ص۴۶۲ وابن جریر پارہ ۳ جزء ۳ سورہ آل عمران ص۲۰۸ (۲) مسلم کتاب الایمان باب بیان الثلاثۃ الذین لایکلمھم اللہ یوم القیامۃ ج۱ ص۵۵ وابوداؤد کتاب اللباس باب اسبال الازار ص۵۶۵ وترمذی ابواب اللباس باب فی کراھیۃ جر الازار ج۱ص۳۰۲ ونسائی کتاب الزینۃ باب اسبال الازار ج۲ص۲۵۴ وابن ماجہ کتاب اللباس باب من جر ثوبہ من الخیلاء ص۲۶۳۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا'' صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا اگر چہ کوئی معمولی سی چیز ہو؟ فرمایا درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو'' (۱) حضرت انسؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''بڑے بڑے گناہ یہ ہیں، خدا کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا'' (۲) ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانہ پائے گا'' (۳) چہرے کی خصوصیت شاید اس لئے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھیٹھائی دکھائی جس کا اثر چہرے پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اس لئے خاص طور سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے، فرمایا ''جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے'' (۴) روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی، لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے، چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے، حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو، کیوں کہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے پھر بے برکتی ہو جاتی ہے، کیسے بلیغ فقرے ہیں فانه ينفق ثم يمحق (۵)۔

جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بے باکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین ج ۱ ص ۶۷۔ (۲) سنن نسائی کتاب المحاربة باب فی ذکر الکبائر ج ۲ ص ۱۴۷۔ (۳) سنن ابی داؤد کتاب الایمان باب التغلیظ فی الیمین الفاجر ص ۴۶۲۔ (۴) صحیح بخاری کتاب البیوع باب یمحق اللہ الربوا ج ۱ ص ۲۸۰ و مسلم کتاب البیوع باب النہی عن الحلف فی البیع ج ۱ ص ۶۴۱ و ابوداؤد کتاب البیوع باب فی کراهیة الیمین فی البیع ص ۵۷۴ و ترمذی و نسائی کتاب البیوع باب المنفق سلعته بالحلف ج ۲ ص ۱۸۶ و منذری باب ترغیب التجار فی الصدق ج ۲ ص ۱۷۔ (۵) مسلم کتاب البیوع باب النہی عن الحلف فی البیع ج ۱ ص ۶۴۱ و نسائی کتاب البیوع باب المنفق سلعته الخ ج ۲ ص ۱۶۸ و ابن ماجہ ابواب التجارات باب ماجاء فی کراهیة الایمان ص ۱۶۰۔

خلاف ہے، قرآن پاک کی آیت اوپر گذر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت وخواری کا سبب ہے، وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (قلم:۱۰-۶۸) حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے، یا ندامت اور شرم ساری کا موجب ہے“ (۱)۔

☆

(۱) ابن ماجہ باب الیمین حنث او ندم ص ۵۳ و صحیح ابن حبان منذری کتاب الترغیب والترھیب باب ترغیب التجار فی الصدق ج ۲ ص ۱۷۔

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے، کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں، جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے، فرمایا:

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا. (بنی اسرائیل:۱۷-۳۴)　　بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔

اور جس کی باز پرس خدا فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا، فرمایا:

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ. (توبہ:۹-۷۷)

پس اس کا اثر ان کے دل میں خدا نے نفاق رکھا اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے، اس لئے کہ انہوں نے خدا سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

صحیحین میں ہے کہ ”منافق کی نشانی تین ہے، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے“ (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) ”اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے“ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے، جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت دار بنایا جائے، خیانت کرے، جب بولے جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے خلاف کرے، جب جھگڑے گالی بکے(۱)۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بولو تو سچ بولو، اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو، اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو“(۲)۔

---

(۱) کتاب الترغیب والترهیب منذری باب الترغیب فی الصدق ج۲ص۱۹۲۔ (۲) احمد، حاکم، ابویعلی، بیہقی، منذری کتاب الترغیب والترهیب ج۲ص۲۰۱باب انجاز الوعد۔

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمان داری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے، اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا، علیٰ ہٰذا عام مسلمانوں، ائمۂ وقت اور اپنے متفقہ قومی وملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے، اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں، فرمایا:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.	اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو، اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بددیانتی کرو۔

(انفال:۸-۲۷)

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورا نہ کیا جائے، ایمان داری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے، دین وملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ ورسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے، یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں، اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آچکی ہے کہ ''منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے'' (۱) ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے

(۱) صحیحین وغیرہ، بحوالہ کتاب الترغیب والترہیب باب انجاز الوعد ج ۲ ص ۲۰۲۔

کہ انہوں نے کہا کہ خدا کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے، لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا، اگر چہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہے گا خداوند اب کیسے لاؤں، دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقۂ ہاویہ میں لے جاؤ، وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا اور اس کے پیچھے گرے گا، یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا، جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا، پھر انہوں نے فرمایا، نماز امانت ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے، راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براءؓ بن عازب صحابی کو سنائی، انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (نساء:۴-۵۸)

یعنی "بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو" (۱)۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے، خیانت کریں گے، امانت داری نہیں کریں گے اور نذر مانیں گے تو پوری نہ کریں گے" (۲)۔

آنحضرت ﷺ جن بری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک خیانت بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت برا اندرونی ساتھی ہے (۳)۔

خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا، چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے، مگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ ان کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا:

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَۃٍ مِّنْھُمْ (مائدہ:۵-۱۳)

اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی ایک خیانت کی۔

---

(۱) مسند احمد، بیہقی، منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد ج۲ص۲۰۱۔ (۲) صحیح بخاری و صحیح مسلم منذری باب مذکور ج۲ص۲۰۱۔ (۳) ابوداؤد و نسائی، ابن ماجہ منذری باب مذکور ایضاً ص۲۰۲۔

یعنی ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے، حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لئے کیا:

ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ. (یوسف:۱۲-۵۲)

تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بے وفائی کی، ان کی بے وفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، خدا نے فرمایا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَةَ نُوْحٍ وَّامْرَاَةَ لُوْطٍ ؕ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا (تحریم:۶۶-۱۰)

خدا نے کافروں کے لئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی، یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں، تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی، تو یہ دونوں (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں کو خدا سے ذرا نہ بچا سکے۔

یہ دل کی خیانت تھی۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی، یہاں تک کہ چشم وابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو، اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا:

یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (مومن:۴۰-۱۹)

اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔

پھر اس سے چھپ کر کیوں کر کوئی کام کر سکتا ہے۔

☆

غداری اور دغابازی

غداری اور دغابازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے، قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے، عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے، کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے، ان کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ عَاھَدْتَّ مِنْھُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَھُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّھُمْ لَا یَتَّقُوْنَ. فَاِمَّا تَثْقَفَنَّھُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِھِمْ مَّنْ خَلْفَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ. وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْۢبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ.

(انفال:۸-۵۶،۵۷)

جن سے تو نے معاہدہ کیا پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ (خدا کا لحاظ) نہیں رکھتے، سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پاوے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں شاید وہ عبرت پکڑیں، اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے، اللہ کو دغاباز خوش نہیں آتے۔

اس آیت میں گو ان کافروں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغابازی کرتے تھے، مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری، دغابازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے، بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا، پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا، فرمایا:

وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْکَنَ مِنْھُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ.

(انفال:۸-۷۱)

اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے خدا سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں تو خدا نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو خدا تو سب کا حال

جانتا ہے، اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس نے ان کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا“ (۱) یعنی اس سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی، آنحضرت ﷺ اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ ”بدعہدی نہ کرنا“ (۲) یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غداری نہ کی جائے، ظالم بادشاہوں، حاکموں، افسروں، سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب وہ ان کے قابو میں آجاتا ہے تو اس کو سزا دیتے یا مروا دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا اور پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں، اگرچہ مقتول کافر (۳) ہی کیوں نہ ہو“۔

خدا فرماتا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ:۵-۱) اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول وقرار) کو پورا کرو۔

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں وعدے اور معاہدے داخل ہیں جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے، یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے، یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بہ حرف پورا کرنا ضروری ہے، ایک دفعہ امیر معاویہؓ نے رومیوں سے مدتِ متعینہ کے لئے کوئی معاہدہ کیا، اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لے کر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں، یہ دیکھ کر عمروؓ بن عبسہ نامی ایک صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہیں، امیر معاویہؓ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے، (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے“ یہ سن کر امیر معاویہؓ واپس چلے آئے۔ (۴)

(۱) صحیح مسلم کتاب الجهاد والسیر باب تحریم الغدر ج۲ص ۶۳، ۶۴ (۲) ایضاً (۳) سنن ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد ص۲۰۲، ۲۰۳ (۴) سنن ابی داوٗد کتاب الجهاد باب فی الوفاء بالعهد ص ۳۷۹، ۳۸۰۔

غور کی بات ہے کہ امیر معاویہؓ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا، رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا اور امیرِ لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے، یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے، یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے، بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا، لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لئے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو، قرآن نے اس کا نام افک رکھا ہے، یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لئے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گنہ گار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں طعمہ نام مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی کے گھر میں چوری کی، مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا، وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا، یہ معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا، آنحضرت ﷺ نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحیِ الٰہی نے دفعتاً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا (۱) دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی، اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی، لوگوں نے اس کو پکڑا آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا، آپ ﷺ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا، اس وقت یہ وحی آئی (۲) بہر حال واقعہ جو کچھ ہو، امر مشترک یہ ہے کہ گنہ گار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گنہ گار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں:

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ	ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر) یہ سچی کتاب اتاری ہے کہ
النَّاسِ بِمَآ أَرٰكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ	تو لوگوں کے درمیان اس کے ذریعہ جو خدا نے تجھ کو سوجھایا،
خَصِيْمًا. وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا.	انصاف کر اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑ اور

(۱) جامع ترمذی ابواب التفسیر تفسیر سورہ نساء ج ۲ ص ۱۳۳۔ (۲) تفسیر طبری سورہ نساء آیت إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ ج ۵ ص ۱۵۹۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا . یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا . (نساء:۴-۱۰۵تا۱۰۸)

اللہ سے قصور معاف کرا، بے شک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے اوران کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں، بے شک اللہ خیانت کار، گنہ گار کو دوست نہیں رکھتا، وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور خدا سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔

آگے چل کر ہے:

وَمَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا . (نساء:۴-۱۱۲)

اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے، پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے، اس نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

ان آیتوں میں خیانت کارانہ تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے، سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے، پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے، پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گنہ گار ہیں اور خدا کی محبت سے محروم ہیں، یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لئے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں اور خدا سے نہیں شرماتے، جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے، اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کرسکتا، اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا، اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا۔

پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی، یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی، خدا نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے، اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی:

وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ (ممتحنہ:۶۰-۱۲)

اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے، پھر بن کے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے، خدا نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا. (احزاب:۳۳-۵۸)	اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کئے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چوں کہ ان کی عزت پر حرف رکھنا ہے، اس لئے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے، اس کو کوڑے مارے جائیں:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا (نور:۲۴-۴)	اور جو لوگ شریف بی بیوں کو عیب لگاتے ہیں، پھر نہ لائے چار گواہ تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو اور وہ فاسق ہیں مگر جنہوں نے توبہ کی۔

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لئے بے اعتبار ہوگئی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا، حالاں کہ وہ بے گناہ ہو یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا(۱) یہ گویا قذف یعنی تہمتِ بے جا کی مثالی سزا ہوگی، ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس میں جو برائی نہیں اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے'' (۲) یعنی اس سے بچنا چاہئے۔

---

(۱) و (۲) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی حق المملوک ص ۷۰۲۔

چغل خوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسوخ جتائے اور چوں کہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو، اسی لئے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی چاہئے یہ لفظ کہے ہیں:

مَشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ۔　(قلم: ۶۸-۱۱)　جو چغلی کھاتا پھرتا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو، فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ.

اے ایمان والو! اگر کوئی گنہ گار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلو، کہیں کسی قوم پر نادانی سے جانہ پڑو، پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگو۔

(حجرات: ۴۹-۶)

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور چوں کہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں بالخصوص عزیز و اقارب اور دوست واحباب میں نااتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے، اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا:

المشاؤن بالنميمة المفسدون بين الاحبة

جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔

(مسند احمد ج ۶ ص ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید)

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک قبرستان کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ

ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا (۱)۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الا انبئکم ما العضۃ ھی النمیمۃ القالۃ بین الناس (۲)

کیا میں تم کو بتاؤں کہ عضہ کیا ہے، وہ چغل خوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔

لغت میں عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں، اس لئے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لئے جائیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علاحدگی کرنا چغل خوری کی حقیقت میں داخل ہے، لیکن اگر سحر کے معنی لئے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغل خوری میں مشابہت ومناسبت ہے، کیوں کہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بی بی میں علاحدگی کرائی جاتی ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے:

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ (بقرہ:۲-۱۰۲)

اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے، لیکن بعض علما کے نزدیک یہ مقصد چغل خوری سے حاصل کیا جاتا تھا (۳)۔

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ ”فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا“ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو یہ ہدایت کی تھی:

لا یبلغنی احد من اصحابی عن احد شیئاً فانی احب ان اخرج الیکم وانا سلیم الصدر (۴)

میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے، کیوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر وہ ہوتی ہیں جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں، بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے، بعض حالتوں میں جس

(۱) صحیح بخاری کتاب الوضوء باب من الکبائر ان لا یستتر عن بولہ ج ۱ ص ۳۵ و صحیح مسلم کتاب الطھارۃ باب الدلیل علی نجاسۃ البول ج ۱ ص ۱۲۷۔ (۲) مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم النمیمۃ ج ۲ ص ۳۹۵۔
(۳) دیکھئے تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۴۳ و مابعد۔ (۴) ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث ج ۲ ص ۶۶۷۔

شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناگوار گذرتی ہے، بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں، غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور جو لوگ اس بداخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ وفساد کی آگ بھڑکائیں، اسی بنا پر اہلِ عرب چغل خوروں کو ہیزم بردار یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں اور ایندھن کے لئے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آتشِ فتنہ وفساد کے لئے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ''حمالة الحطب'' یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی (۱)۔

ان میں بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہیں، یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں، اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتّات کہتے ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لایدخل الجنة قتّات (۲)	جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں، تاکہ ان کا اثر بڑھ جائے، اسی لئے عربی زبان میں چغل خوری کو ''وشایہ'' کہتے ہیں، جس کے معنی نقش ونگار کے ہیں، اور ادھر کی ادھر لگانے کے لئے چغل خوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے، اسی مناسبت سے چغل خوری کو ''سعایہ'' بھی کہتے ہیں، جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ تحریر وکتابت اور رمز واشارت سے بھی چغل خوری کی جاسکتی ہے اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں، بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں، یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ ''فلاں شخص یہ کہتا تھا'' بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ''فلاں شخص یہ کام کرتا تھا''۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا'' چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے، بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے۔

---

(۱) دیکھئے تفسیر کبیر ج ۶ ص ۶۷۱۔ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات ج ۲ ص ۲۶۸۔

اس بنا پر چغل خوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے اور رسول اللہ ﷺ نے ''ترکِ مالایعنی'' کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے، اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔

چغل خوری ایک فتنہ پردازی ہے، جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور قتل وخوں ریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب وفریب، نفاق، غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں، اس لئے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہِ کبیرہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن ومعاشرت کا ایک جز ہوگئی ہے، اگر امرا کے درباروں میں تملق وخوشامد کے لئے چغل خوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریحِ خاطر اور لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے، اس لئے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہِ کبیرہ نہیں سمجھتے، اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہورہا تھا، فرمایا ''ان پر عذاب ہورہا ہے، لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا، حالاں کہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں، ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا'' (۱)۔

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں، یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے یہ فرمادیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں، پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہِ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کردیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے، محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں، حالاں کہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگے ہیں، حالاں کہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر وموبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ افکِ عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے:

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب النمیمة من الکبائر ج ۲ ص ۸۹۴۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۖ وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ. (نور: ۲۴-۱۵)

جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل در نقل کرنے اور اپنے منہ سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا، حالاں کہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دل چسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالاں کہ وہ معمولی نہیں ہوتیں۔

کشفِ عورت اور کشفِ عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے، یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل اور ناقابلِ اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے، بغض وانتقام لینے، یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغل خوری سے کام لیتے ہیں، اس لئے ان کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ. هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ. مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ. (قلم: ۶۸-۱۰ تا ۱۲)

اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے، اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے، حد سے آگے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے۔

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت وآبرو محفوظ رہے اور ان کے باہمی تعلقات خوش گوار رہیں، اس بنا پر جن بداخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت وآبرو کو صدمہ پہنچتا ہے اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوٓا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَـٰبِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَـٰنِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَـٰٓئِكَ هُمُ الظَّـٰلِمُونَ. يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ.

(حجرات: ۴۹-۱۱، ۱۲)

مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو، ایمان لائے پیچھے بد تہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی (خدا کے نزدیک) ظالم ہیں، مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو، کیوں کہ بعض شک داخلِ گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے، بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقویٰ کرو، بے شک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول وعمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہئے، لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقہ سے مسلمانوں

کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے وہ غیبت ہے، امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمزواشارت، تحریر وکتابت اور محاکات ونقالی، ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کئے جاسکتے ہیں اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین ودنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جاسکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہایت پرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے(۱) اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے، جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں۔

۱- انسان کا گوشت محض اس کی عزت وحرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جو چیز اس کی عزت وحرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

۲- لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدتِ غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں، اگرچہ یہ بھی ایک برا فعل ہے، تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص رودررو کسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے، تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی، لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے اور بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

۳- لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، اس لئے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے اس سے اس کی سخت قساوت وسنگ دلی اور بغض وعداوت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اس لطف ومحبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۴- مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کے بہ جائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا، اس لئے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی، جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی، یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے، اور صرف رمزواشارہ سے کام لینا چاہئے، اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

(۱) احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۱۰۱۔

ایک حدیث میں ہے کہ شبِ معراج میں میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت وآبرو لیتے تھے(۱)۔

اعمال اور اعمال کی جزاوسزا میں مناسبت ہوتی ہے، یہ لوگ چوں کہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے، یعنی ان کی غیبت کرتے تھے، اس لئے عالمِ برزخ میں ان کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں (۲)۔

اس حدیث میں اعمال اور جزاوسزا کی مناسبت ظاہر ہے، مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے، اس لئے یہ بدبو اسی مردار خواری کا نتیجہ تھی۔

اس حدیث میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب کی تشہیر و تفضیح کی جائے، اس لئے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں، اسی طرح ان کے اس عمل کی نجاست وگندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے، اسی نکتہ کو آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں بلاتشبیہ وتمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا ”اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو، لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے، نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو، کیوں کہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا، خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کر دے گا“ (۳)۔

لغت کے رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں، مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لئے کوئی ضروری قید نہیں، اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں، لیکن آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ ص ۶۶۹۔ (۲) ادب المفرد باب قبل الغیبۃ ص ۱۴۶۔ (۳) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ ص ۶۶۹۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا ''تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے'' کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو، جس کو میں بیان کرتا ہوں تو فرمایا اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا (۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں، بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی، لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہلِ لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے، باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے، بلکہ سب وشتم میں داخل ہے۔

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کے ذریعہ سے بھی غیبت کی جاسکتی ہے، کسی شخص کی نقل کرنا، مثلاً ایک شخص لنگڑا ہے، تو اس کے اس عیب کے نمایاں کرنے کے لئے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے، ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا (۲)۔

اسی طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے:

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ.	(قلم: ۶۸-۱۱)	(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے، (ادھر کی اُدھر اُدھر کی ادھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔
وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ.	(ھمزہ: ۱۰۴-۱)	ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دل خراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے لئے اہلِ لغت کی تصریحات پیشِ نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں:

۱- ہمز سامنے اور لمز پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔

(۱) و (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ ص ۶۶۸، ۶۶۹۔

۲- ھمز خاص طور پر لوگوں کے نسب کی برائی بیان کرنا۔

۳- ھمز ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے غیبت کرنا۔

۴- ھمز زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔

۵- ھمز برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

۶- لمز آنکھ ہاتھ سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی برائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے، لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے، تاکہ ان کو تنبیہ اور ندامت وشرمندگی ہو، اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے تو ان کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی، اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا، قرآن پاک میں کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغہ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے، کہ جو جھوٹ بولتے ہیں یا کفر کرتے ہیں ان کا حال یہ ہے، اس طریقۂ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لئے گئے ہیں وہ اس لئے کہ ان کی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے موقع بھی آتے ہیں جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے، قرآن پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا. (نساء:۴-۱۴۸)	اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی، لیکن جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے، اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے، لیکن جب وہ پاس

آیا تو اس سے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی، (۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لئے اس کے احوالِ واقعی کا اظہار جائز ہے، غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے، یا کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے، امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے:

۱- حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی میں فریاد کرنا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے لصاحب الحق مقالا۔

۲- مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بہ غرضِ احتساب (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت از بام کی ہیں)۔

۳- فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہندؓ بنت عتبہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت ابوسفیانؓ کے بخل کی شکایت کی، (اور آپ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا)۔

۴- ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی غرض سے ایک شخص کو "بئس ابن العشیرۃ" "قبیلہ کا برا آدمی" کہا تھا۔

۵- ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو، مگر غایتِ شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑھ نہ ہو مثلاً اعمش، یا اعرج، کیوں کہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا، رسول اللہ ﷺ نے خود ایک صحابی کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔

۶- علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تا کہ اس کو تنبیہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً مخنث کو مخنث کہنا (۲)۔

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب مایجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب ج ۲ ص ۸۹۴۔ (۲) احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۱۰۶۔

دورخاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص وصداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخاپن نہیں پایا جانا چاہئے، یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہئے، بلکہ یہ بداخلاقی چغل خوری سے بھی زیادہ سخت ہے، کیوں کہ چغل خور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخا آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دورخے پن کے لئے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے، تو بھی وہ دورخا کہلائے گا، نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے، اسی لئے صحابۂ کرامؓ اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے، ایک بار حضرت عبد اللہؓ بن عمر سے کہا گیا کہ ''ہم لوگ امرا اور حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں'' بولے ''ہم لوگ عہد رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے''(۱) اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِهِمۡ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَکُمۡ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ. (بقرہ:۲-۱۴)	اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لاچکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو اردو میں دورخا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لئے وعیدِ شدید آئی ہے، مثلاً فرمایا ''قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے برا دورخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو

(۱) صحیح بخاری کتاب الاحکام باب مایکرہ من ثناء السلطان ج۲ص۱۰۶۴۔

اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور"(۱)۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

"دنیا میں جس کے دو رخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی"(۲) یہ گویا اس کی اس عادتِ ذمیمہ کی تمثیل ہوگی، کہ وہ لوگوں سے دورنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب ماقیل فی ذی الوجھین ج۲ص۸۹۵و صحیح مسلم و مالک۔ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی ذی الوجھین ج۲ص۶۶۸۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام میں بدنیتی ہی بدنیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسنِ نیت نظر نہیں آتا، دوسرے کی طرف اَن ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا ہے، دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اس سے کترانے لگتا ہے، اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (حجرات:۴۹-۱۲)
اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض وحسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس وتلاش کی بھی ممانعت فرمائی، کیوں کہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں، فرمایا:

"تم بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو اور نہ آپس میں حسد رکھو اور نہ بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے، آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ" (۱)۔

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے، اس کی مثال خود آنحضرت ﷺ نے پیش فرمائی ہے،، ایک دفعہ آپ ﷺ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواجِ مطہرات ؓ میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں، آپ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں وہ انصاری آپڑے، وہ آپ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب قوله يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ ج ۲ ص ۸۹۶ و مسلم وابوداؤد و ترمذی و مالک باب تحریم الظن۔

اور واپس پھرنے لگے، آپ ﷺ نے فوراً آواز دی، اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے(۱)۔

(۱) صحیح مسلم کتاب السلام باب انه یستحب لمن رؤی خالیاً بامراءۃ یقول هذه فلانة ج۲ ص۲۴۲۔

مداحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنائت اور ذلت کی علامت ہے اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے اور یہ اس کے لئے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے، خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے، جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں، یہ جھوٹ ہے، دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے، اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا، یہ نفاق ہے، تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لئے اربابِ قدر وجاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے، جس سے اس کی دنائت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے۔

بے جا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی، تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے، اور پھر اپنے اس مفروضۂ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے اور پے درپے تعریفیں سن کر اس کو یقین آجاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے، بادشاہوں، امیروں، دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بہ دولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس طرح وہ بر خود غلط ہو جاتے ہیں، اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

قرآن پاک نے یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے(۱) اور ان کے انجام کی یہ خبر ان کو دی ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَالَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (آل عمران:۳-۱۸۸)

جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہیں اور جو انہوں نے نہیں کیا، اس پر تعریف کئے جانے کو پسند کرتے ہیں تو ان کو نہ سمجھنا پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری تفسیر آل عمران ج ۲ ص ۶۵۶۔

ان آیتوں کا شان نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے(۱)، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کیے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کیے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا، اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرتِ الٰہی دست گیری فرمائے اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہ گار ہوتے ہیں، وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں، جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سنا تو فرمایا تم نے اس کو برباد کردیا(۲)، ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہو اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے(۳)۔

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغرور ہوجائے گا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہوجائے گا، اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لئے بھی حکم نہیں لگانا چاہئے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں ان کو سن کر ان کے نفس موٹے ہوجاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہوجاتی ہے، ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں، تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو" (۴) ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپ ﷺ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں، آپ ﷺ نے فرمایا "اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کردو" (۵)۔

---

(۱) فتح القدیر شوکانی ج ۱ ص ۳۷۴ مطبوعہ مصر (۲) صحیح بخاری باب کراهية التمادح ج ۲ ص ۸۹۵ (۳) صحیح بخاری باب مذکور وسلم وابوداؤد باب مذکور (۴) صحیح مسلم وابوداؤد کتاب الادب باب کراهية التمادح ج ۲ ص ۶۲ (۵) باب یحثی فی وجوہ المداحین ص ۶۸۔

بخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے، یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے، خیانت، بددیانتی، بے مروتی، بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دنائت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں، اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا، محتاجوں کو دینا، یتیموں کی خبر گیری، اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے، آنحضرت ﷺ نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبرئیلؑ کی آمد کا حال سنایا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو آپ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بنا پر دلایا وہ یہ ہیں:

''یا رسول اللہ ﷺ آپ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں، مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں'' (۱)۔

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی ''بخیل'' نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کے خصوصیات قرار نہ پاتے۔

بخالت ان بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزا و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں، کیوں کہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا، وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہوسکتا، سورۂ مدثر آغازِ نبوت کی سورتوں میں سے ہے، اس میں دوزخیوں کے سوال وجواب کا ایک مکالمہ ہے، ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے، تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے اور یہ سب اس لئے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا و سزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے:

---

(۱) صحیح بخاری ج ۱ باب کیف کان بدء الوحی الخ ص ۳۔

مَاسَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ. قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ. وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ. وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ. وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ.

(مدثر:۴،۷۴-۴۲تا۴۶)

تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے اور وہ عمل کی جزا و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیوں کہ جیسا کہ کہا گیا، جو مذہبی جزا و سزا کا قائل نہیں، وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کرسکتا، یہی نکتہ سورہ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے دہرایا گیا ہے، فرمایا:

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ. فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ. وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ.

(ماعون:۱۰۷-۱تا۳)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور فقیر کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کیے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں، کیوں کہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہوسکتی جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا میں پانے کا متوقع رہتا ہے اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے اور وہ کبھی ضائع نہیں جاسکتی۔

ایک اور مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کی روزی زیادہ نہیں اور اس لیے اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے، کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، خدا فرماتا ہے:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ. وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ. وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا. وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا.

(الفجر:۸۹-۱۷تا۲۰)

یہ خیال صحیح نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہیں کرتے اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں، مگر یہ سب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح

ہیں، سورہ ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو دولت کی تھیلیوں کو گویا اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کے بہ دولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا اور یہ چیز اس سے کبھی علاحدہ نہ ہوگی، حالاں کہ یہ کتنا خیالِ خام ہے، فرمایا:

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ. یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ. كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ.

(ہمزۃ:۱۰۴-۲تا۴)

جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گنا کیا اس کو، سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ہرگز یوں نہیں وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت رکھنے اور کار خیر میں خرچ نہ کرنے والے کو اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کھال تک کھینچ لے:

كَلَّاۤ اِنَّهَا لَظٰى. نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى. تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى. وَجَمَعَ فَاَوْعٰى.

(معارج:۷۰-۱۵تا۱۸)

ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے، کھینچ لینے والی کھال، پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ دی اور پھر گیا اور اکٹھا کیا اور سینتا۔

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے، کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے، سونے چاندی کی اینٹیں خود بہ خود روٹی کپڑا اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں، اس لئے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں، ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو خدا نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ اپنے لئے درہم و دینار نہیں جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ. یَّوْمَ یُحْمٰى عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ.

(توبہ:۹-۳۴،۳۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنا دو، جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لئے گاڑ کر رکھا تھا، تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت

ہے، اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہیے، اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف ہے اور اس جماعت کے لئے مضر ہے، جس کے رکن وہ خود ہیں:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: ۳-۱۸۰)

اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے، روک کے رکھتے ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے، جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں، اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔

یعنی جس دولت کو انہوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا تھا، وہ قیامت کے عالمِ مثال میں واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا، حدیث میں ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا(۱)۔

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلقِ خدا اور خدا کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی، اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے:

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۨالَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (حدید: ۵۷-۲۳،۲۴)

اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا، جو آپ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔

اور جس سے خدا محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے، اسی لئے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز واقربا بھی محبت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے، اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخل کی سب سے بڑی تمثال کا نام قارون بتایا گیا ہے، جس کا قصہ سورۂ قصص میں ہے، یہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مال دار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی خدا جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہوگی) خزانے تو الگ رہے، خزانوں کی کنجیوں کے گچھوں کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے

(۱) صحیح بخاری کتاب الزکوۃ باب اثم مانع الزکوۃ ج۱ص۱۸۸۔

اٹھا سکتے تھے، تو بہ جائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا، کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے اس کو اتنا مال دار بنایا کہتا کہ یہ مال ودولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے، اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گذر چکے ہیں، جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے، چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی انجام یہ ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی، خدا نے فرمایا:

اَوَلَمۡ یَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَہۡلَکَ مِنۡ قَبۡلِہٖ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مَنۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُ قُوَّۃً وَّ اَکۡثَرُ جَمۡعًا (قصص: ۲۸-۷۸)

کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقت ور اور اس سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔

زمانہ محمدی ﷺ کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ. (لہب: ۱۱۱-۲)

ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہوسکتا، جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے:

ھٰۤاَنۡتُمۡ ھٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ وَ مَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ وَ اللّٰہُ الۡغَنِیُّ وَ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ (محمد: ۴۷-۳۸)

ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جارہا ہے، تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے، اور تم ہی محتاج ہو۔

یعنی اس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔

بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے، کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے، نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت نہ آبرو، ہر شخص اس کو ذلیل وخوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقرا اس کے لئے بددعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے، وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے، ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ

سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کر لے، چور اس کے در پے، ڈاکو اس کے لاگو، زہرہ وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہیں، مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا، لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثوں نے اللے تللے اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لئے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے، وہ اس مالِ مفت کو دم کے دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلس وقلاش ہو جاتی ہے۔

خدا اپنے رسول ﷺ کی زبانی فرماتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى. وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى. فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى. وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى.

(لیل: ۹۲-۸ تا ۱۱)

اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا، اور (خدا کی یا نیکی کی باتوں کی) پروانہ کی اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کو سخت کام کے لئے آسان بنائیں گے اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لئے بہ طور سزا کے آسان کر دیتا ہے، وہ بری عادت وخصلت اور برے کردار ہیں، جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے اور ان کو صرف اس لئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے بڑی آسانی سے کر گذرتا ہے، بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے، راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا، عزیز واقارب، دوست واحباب سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں، پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڈھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے، نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئے گا، تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِىْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ.

(منافقون: ۶۳-۱۰)

اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (خدا کی راہ میں) خرچ کرو، (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی، کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا، اس کے لئے سامان پہلے سے چاہیے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں، خوب خوب وعدے کرتے ہیں، کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل وکرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے، وہ کریں گے، مگر جب اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں اور نیکی کے ہر راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَـئِنۡ اٰتٰٮنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَـنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ . فَلَمَّاۤ اٰتٰٮهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ. (توبہ:۹-۷۵،۷۶)	اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکو کاروں میں سے ہوں گے، پھر جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے لگے اور ٹل کر پھر گئے۔

خدا فرماتا ہے، کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا:

فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ (توبہ:۹-۷۷)	تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے، شاید اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں، بخل اور بد خلقی (۱)، رسول اللہ ﷺ جن برائیوں سے بچنے کی خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک بخل بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ "خداوندا میں بخل، کسل مندی، کبرسنی، قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں (۲)۔

اسلام میں زکوۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، یہ زکوۃ کی فرضیت اور صدقات ومبرات کی ترغیبات شریعتِ محمدی ﷺ میں اسی لئے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک وصاف رہیں۔

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال ودولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ خدا کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے، وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں، جس کو علم ملا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسروں کو بتائے، جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے، اسی لئے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے:

---

(۱) جامع ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی البخل ج۲ص ۱۷ (۲) صحیح مسلم کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار باب التعوذ من العجز والکسل ج۲ص ۳۴۸۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ۔ (بقرہ:۲-۱۴۰) اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا“ (۱) اس لئے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، اللہ کے حق اور بندے کے حق، اللہ کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندوں کے حقوق کا مجمل مجموعہ زکوٰۃ، یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے، دیکھئے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدمِ بجا آوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے:

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ. قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ. وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ. (مدثر:۷۴-۴۲تا۴۴) کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی، کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔

پہلا گناہ حقوقِ الٰہی کی بجا آوری سے انحراف اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورہ ماعون کے آخر میں ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ. وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ. (ماعون:۱۰۷-۴تا۷) پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پروا رہتے ہیں، وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے، کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں اور صرف دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں، یہ حقوقِ الٰہی سے تغافل ہے اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ پانی اور ایسی ہی دوسرے بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدمِ تعمیل کا سبب بنتا ہے اور اس لئے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ کتاب العلم الفصل الثالث ج ۱ ص ۸۶ بہ تحقیق ناصر الدین البانی مطبوعہ دمشق۔

حرص وطمع

حرص وطمع یا لالچ وہ برائی ہے جس میں نفس کی دنائت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، خصوصاً وہ حرص وطمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو، عربی میں اس کو شُحّ کہتے ہیں، جس کی برائی قرآن مجید میں کئی موقعوں پر آئی ہے، خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے، گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں، شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اس لئے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں، یا ایک شخص کے کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان وایثار کا سلوک ہو اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے، تو پھر وہی گھر جو پہلے غم کدہ تھا عشرت کدہ بن جائے گا، میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن مجید کی تعلیم ہے:

وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا. (نساء:۴-۱۲۸)	اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے۔

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں، تو اللہ تعالیٰ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے، سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے، جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی، فرمایا:

وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ. (تغابن:۶۴-۱۶)	اور خرچ کرو، اپنے لئے بھلائی کمرو اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔

ایک اور موقع پر ہے، کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت

پر مقدم رکھتے ہیں:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (حشر:۵۹-۹)

اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں، اگر چہ خود ان کو ضرورت ہو اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔

اسی کا نام ایثار ہے، یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا،، جب تک حرص وطمع کا خاتمہ نہ ہو، اسی لئے خدا نے فرمایا جو حرص وآز سے پاک ہوں گے، وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا، بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے، اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے، کیوں کہ اس میں دو اور بداخلاقیاں شامل ہیں، ایک بخل اور دوسری حسد، فرمایا:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا. (نساء:۴-۳۲)

اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے، مردوں کے لئے ان کی کمائی ہے اور عورتوں کے لئے ان کی اور اللہ سے مانگو اس کے فضل میں سے حصہ، بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی، کاش خود اسے ملتی، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض وکرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لئے ہاتھ پھیلانا چاہئے، اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا، اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی، ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا، اسی لئے فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ. لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (حجر:۱۵-۸۷،۸۸)

اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے، تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پسار، جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی، اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟

یہی حرص وطمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے،

آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ''حرص وطمع سے بچو، کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا، اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا، اور حرام کو حلال سمجھا'' (۱) یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے، فرمایا ''حرص سے بچو کیوں کہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی، کہ انہوں نے (بے گناہوں کا) خون بہایا، اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا اور اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا'' (۲)، آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ''حرص سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں، اسی نے ان کو کہا تو انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا، اسی نے ان کو فسق وفجور کے لئے کہا تو انہوں نے فسق وفجور کیا'' (۳)، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے'' (۴)، حریص آدمی اس لئے ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا وہ نہیں ملا، فلاں کے پاس یہ ہے، میرے پاس نہیں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھنے والی فرمایا، نسائی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے'' (۵)، سبب ظاہر ہے، کہ ایمانِ کامل کا نتیجہ صبر، توکل اور قناعت ہے اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے، ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ ''انسان بوڑھا ہوتا ہے، مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں، جینے کی خواہش اور مال کی حرص'' (۶) کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیئے جائیں وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین وایمان کو برباد کر دیتی ہے (۷)۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم الظلم ج۲ص ۳۸۷ (۲) صحیح ابن حبان ومستدرک حاکم کتاب الایمان باب الظلم ظلمات الخ ج۱ص۱۲ (۳) ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی الشح ج۱ص ۲۳۸ وحاکم کتاب الزکوٰۃ باب ذم الشح ج۱ص ۴۱۵ وکتاب الایمان باب الظلم ظلمات الخ ج۱ص۱۱ (۴) صحیح ابن حبان وابوداؤد کتاب الجهاد باب الجراۃ والجبن ج۱ص ۳۴۰ (۵) نسائی کتاب الجهاد باب فضل من عمل فی سبیل اللہ علی قدمه ج۲ص ۴۵۔

(۶) ترمذی کتاب الزهد باب ماجاء قلب الشیخ شاب علی حب اثنین ج۱ص ۵۹ ومستدرک حاکم کتاب الرقاق باب قلب الشیخ شاب علی حب طول الحیاۃ والمال ج۴ص ۳۲۸ (۷) ترمذی کتاب الزهد بابؔ ج۲ص ۶۳ وصحیح ابن حبان وطبرانی وابویعلی وبزار بحوالہ الترغیب والترهیب منذری باب الترغیب فی الزهد فی الدنیا الخ ج۲ص ۲۳۸۔

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے، کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے، اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے، اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے وہ فطرت کے نظامِ عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے، اسلام نے اس نظامِ عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کر دیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (نساء:۴-۲۹)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمان داری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے، چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے، یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور وظلم سے لے یا غصب کرے، یا چوری کرے، یا اس میں خیانت کرے، رشوت لے، سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا، وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں“ (۱)، جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں، آنحضرت ﷺ کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتادی، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا، آپ ﷺ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے، آپ ﷺ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، فرمایا تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا، کہ لوگ دیکھ لیں، جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں (۲)،

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا ج اص ۵۳ (۲) ایضاً باب من غشنا فلیس منا ج اص ۵۳۔

یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہوا" جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا وہ خدا سے ملے گا تو خدا اس پر غضب ناک ہوگا" (۱) ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا" اگر اس نے قسم کھالی تا کہ وہ ظلم سے مال لے لے، تو خدا سے جب وہ ملے گا تو خدا اس سے منہ پھیر لے گا" (۲)۔

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو" غصب" کہتے ہیں، غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے جو غریب مچھوؤں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے فرمایا:

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا۔ (کہف:۱۸-۷۹)	وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی، جو دریا میں محنت کرتے تھے، تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا، جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا۔

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا، اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سعیدؓ بن زید صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا طوقه الله في سبع ارضين (۳)، تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا، یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے (۴)۔

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے، کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوتِ بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں، حالاں کہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور

(۱) و (۲) صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم الخ ج ۱ ص ۶۶ (۳) صحیح مسلم کتاب البیوع باب تحریم الظلم وغصب الارض ج ۱ ص ۶۴۲، یہ عبارت کئی طرح سے ہے في سبع ارضين، من سبع ارضين، الی سبع ارضين (۴) شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور ج ۱۱ ص ۴۸ مطبع مصریہ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء۔

میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں، اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلادی، جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے، کیوں کہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے''(۱)۔

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے، مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جاکر فریق کے دعویٰ کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرادیتے ہیں:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۸۸)	اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ، تاکہ کھاجاؤ لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور تم جان رہے ہو۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پاکر ان کا مال خلافِ انصاف نہیں کھانا چاہئے، جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (نساء:۴-۱۰)	بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاجاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں اور اب وہ آگ میں پیٹھیں گے۔

(۱) ابوداؤد کتاب الاقضیۃ (القضاء باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ ج ۲ ص ۵۰۴)۔

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے، اسی لئے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے، یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْآ اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً ۢبِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (مائدہ:۵-۳۸)

اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان کے ہات کاٹ ڈالو، سزا ان کی کمائی کی، تنبیہ اللہ کی طرف سے، اور اللہ ہے زور آور حکمت والا۔

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے، اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے، اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا، مرتکبِ فعل کے خبثِ باطن کو ظاہر کرتا ہے، پھر اس کے بہ دولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چوں کہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے، اس لئے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہلِ عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی، (سورہ ممتحنہ: ۶۰-۱۲) میں ان چند باتوں کا ذکر ہے، جن کا عہد مسلمان ہونے والی بی بیوں سے لیا جاتا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "وہ چوری نہ کریں گی"، فتحِ مکہ کے دن جب مکہ کی خاتونیں اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی اس کا عہد لیا، اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہند نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ میرے اور میرے بچوں کے لئے پورا خرچ نہیں دیتے،

مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں، فرمایا ''تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو، جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو'' (۱)، اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی، دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے، اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہیں۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ ﷺ نے لیا ہے، حضرت عبادہ بن صامتؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے آپ ﷺ نے فرمایا ''ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کرو گے پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری خدا کے ذمہ ہے اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی، تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور خدا نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ میں ہے، چاہے معاف کرے چاہے سزا دے'' (۲)۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چور پر لعنت بھیجی، فرمایا، اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے، پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے (۳)۔

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لئے کرتا ہے کہ وہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں رکھتا، یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو خدا بھی ہم کو نہیں دیکھتا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا'' (۴)۔

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے، مگر حق کے ساتھ'' (۵)، یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو، یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی:

---

(۱) صحیح بخاری کتاب النفقات باب نفقۃ المرأۃ اذا غاب عنھا زوجھا ونفقۃ الولد ج۲ص۸۰۷ (۲) صحیح بخاری کتاب الحدود باب الحدود کفارۃ ج۲ص۱۰۰۳ (۳) ایضاً باب قول اللہ والسارق والسارقۃ الخ ص۱۰۰۴ وباب لعن السارق اذا لم یسم ص۱۰۰۳ (۴) ایضاً باب مایکرہ عن لعن شارب الخمر الخ ص۱۰۰۳ (۵) ایضاً۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ (نساء:۴-۲۹)

اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی، جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں، خدا کی قسم اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا''(۱)۔

ایک صحابی ایک چادر سرہانے رکھ کر سو رہے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا، وہ پکڑ کر آیا تو صحابی موصوف نے آکر سفارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی، کیا تیس درہم کے لئے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی، اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپ ﷺ نے فرمایا مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا(۲)۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپ ﷺ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرا لیتا تھا اور اگر مالک ہشیار ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا اور اگر وہ بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا، میں نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا (۳)۔

☆

(۱) ابوداؤد کتاب الحدود باب فی الحد یشفع فیہ ج۲ص ۶۰۱ (۲) ایضاً باب فیمن سرق من حرز ج۲ص ۶۰۳
(۳) صحیح مسلم کتاب الصلوۃ باب صلوۃ الکسوف ج۱ص ۳۳۴،۳۳۵۔

ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہیں اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کے برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے، لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے ان نازک سے نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا، تشریح کی اور ان کی برائیوں کی تشہیر کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے، جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور جس سے سب سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے، یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے، جسے خدا نے دنیا میں قائم کیا ہے اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہئے، جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا، یا دینے میں کمی کرتا ہے، وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے، فرمایا:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ. اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ. وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ. (رحمٰن:۵۵-۷تا۹)	اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ مت زیادتی کرو ترازو میں اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور مت گھٹاؤ تول۔

اس ترازو سے انسان کا ہر قول وفعل تلتا ہے اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے، جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے، وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے اور یہ بھی چوری ہی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدیں آئی ہیں، حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی، اسی لئے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمان داری کی تاکید بار بار

کی گئی ہے، حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں:

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ. وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ. وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ. (شعراء:۲۶-۱۸۱تا۱۸۳)

اور پورا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھرو ملک میں فساد پھیلاتے۔

یہی حضرت شعیبؑ مدین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گذر میں آباد تھے:

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ. وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ. (ھود:۱۱-۸۴،۸۵)

اور ناپ تول میں کمی نہ کرو، میں تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں اور ایک گھیر لینے والے دن کی آفت کو تم پر ڈرتا ہوں اور اے میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہئے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں، ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے، یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے، مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیبؑ کی یہی نصیحت پھر سورۂ اعراف میں دہرائی گئی ہے:

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (اعراف:۷-۸۵)

تو ناپ اور تول پوری کرو اور مت گھٹاؤ لوگوں کو ان کی چیزیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو، یہ تمہارے لئے بھلا ہے، اگر تم کو یقین ہو۔

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی، اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے، اس کے بعد ہے:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ　(انعام:۶-۱۵۳)　اور ناپ اور تول کو پورا کرو۔

سورہ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔

(اسرائیل:۱۷-۳۵)

اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو اور سیدھی ترازو سے تو لو، یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔

آیت کا اخیر ٹکڑا بتاتا ہے، کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بد اخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا، سورۂ مطففین میں جہاں اس بد اخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے اس بیماری کا یہ علاج بھی بتایا گیا ہے، فرمایا:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ. اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ. وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ. اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ. لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ. يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

(مطففین:۸۳-۱تا۶)

خرابی ہے ان گھٹا کر دینے والوں کی جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں، اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا دیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن کے لئے ان کو اٹھایا جائے گا، جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لئے کھڑے ہوں گے۔

چھپا کر لینا

جو سامان واسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علاحدہ علاحدہ نہ کیا گیا ہو، اس میں سے کوئی چیز دوسرے ساجھیوں سے چھپا کر لے لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مالِ غنیمت میں جو بددیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں، غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے، جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کر دے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے، اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بددیانتی اور چوری دونوں ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہئے، لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصہ ہے اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لئے حلال نہیں ہو سکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں، اسی لئے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے اور یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیرِ عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہ گار ٹھہرے گا اور چوں کہ انبیا (علیہم السلام) بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرا ہوتے ہیں، اس لئے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے، فرمایا:

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران: ۳-۱۶۱)

اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔

پھر فرمایا:

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (آل عمران: ۳-۱۶۱)

اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا، پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

غزوۂ خیبر کے مالِ غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا، خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آکر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہوگیا، مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا، وہ اس پر آگ کا شعلہ ہورہا ہے، لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا، اس کو بھی لاکر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے آگ کا (۱)۔

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی، جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو، یہ سن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہے، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے بھائی نے مالِ غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا، جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا (۲)۔

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہوچکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے، سب لوگ اپنا اپنا مالِ غنیمت لے کر آتے پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا، اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا، اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ "یا رسول اللہ ﷺ یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا کیا تم نے بلالؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟ اس نے کہا سنی تھی، پوچھا پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے، اس نے معذرت کی، فرمایا، تم اس کو قیامت میں لے کر آنا، میں نہیں قبول کرتا" (۳)۔

عمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لاکر پیش کریں، فرمایا "اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو، وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لے گا تو وہ غلول ہے، وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا" (۴)۔

---

(۱) و (۲) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی تعظیم الغلول ج ۲ ص ۳۷۰ (۳) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الغلول اذا کان یسیرا ج ۲ ص ۳۷۱ (۴) سنن ابی داؤد کتاب الاقضیة (القضاء باب فی هدایا العمال ج ۲ ص ۵۰۴)۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے، رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لئے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کر لے(۱)۔

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے، اہلِ غرض ان کو اس کے لئے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے، اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا، اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی(۲)۔

عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے، اور چوں کہ دولت اور تمول نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کر دئے تھے، اس لئے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہش مند رہتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لئے علانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے تھے اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے(۳)، چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری تھی، قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (بقرہ:۲-۱۷۴)	خدا نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، خدا ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

(۱) مجمع البحار علامہ فتنی ج ۲ ص ۳۲۹ (۲) ترمذی ابواب النکاح باب ماجاء فی کراھیۃ مھر البغی ج ۱ ص ۲۱۵
(۳) صحیح بخاری کتاب المحاربین باب الرجم بالبلاط ج ۲ ص ۱۰۰۷۔

"پیٹ میں آگ بھرنا" اس لئے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر خدا کے احکام میں ردوبدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے، اس لئے یہی سزا ان کو ملے گی، ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علما کو اس لئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں، لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی میں عام طور سے ردوبدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے فرمایا:

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ. (مائدہ:۵-۶۲و۶۳)	اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں، ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔
سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ:۵-۴۲)	جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گذر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۸۸)	اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ، اور تم جان رہے ہو۔

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے، رشوت کی ممانعت میں صاف وصریح ہے۔

آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے، (۱) رشوت دینے والے پر یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔

(۱) ابوداؤد کتاب الاقضیۃ باب فی کراھیۃ الرشوۃ ج۲ص۵۰۴۔

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ صحابی کو بھیجتے، وہ ایمان داری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو، یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس میں چندہ کر کے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کئے اور کہا کہ یہ قبول کر و اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو، یہ سن کر حضرت ابن رواحہؓ نے فرمایا ''اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے'' یہودیوں نے ان کی یہ تقریر سن کر کہا کہ ''یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان و زمین قائم ہیں'' (۱)۔

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی، (۲) ایک دفعہ ایک عامل نے آ کر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

> ''عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آ کر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں، یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ اس میں سے جو لے جائے گا، وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائے گا، اونٹ، گائے، بکری، جو ہو، پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا ''خداوندا میں نے پہنچا دیا'' (۳)''۔

اس تقریر میں آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے۔

☆

---

(۱) موطا امام مالک کتاب المساقاۃ ص ۵۳۰ مطبوعہ الجزائر ۱۹۰۷ء (۲) ابوداؤد کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب فی ھدایا العمال ج ۲ ص ۴۰۹ کتاب الاقضیۃ و کتاب الجہاد (۳) صحیح بخاری کتاب الاحکام باب ھدایا العمال ج ۲ ص ۱۰۶۴۔

سودخواری

سودخواری، حرص وطمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص وطمع تو یوں کہ سودخوار اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آجائے، بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کارِ خیر میں دے کر اپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سودخواری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے اور ظلم یوں کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور رحم نہیں کرتا، اسی لئے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا:

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (بقرہ:۲-۲۷۹) نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لو، تو یہ تمہارا ظلم ہے، اور جتنا تم نے دیا ہے، اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے، اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بہ دولت پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے، یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے:

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء:۴-۱۶۱) اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالاں کہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے۔

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جارہی تھی ہمیشہ کے لئے دور کر دیا:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ

جو سود کھاتے ہیں، وہ ایسے اٹھیں گے جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس کھودئے ہوں، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ خرید وفروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح ہے اور اللہ نے خرید وفروخت کے معاملہ کو حلال اور سود کو

رَبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔ یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ۔

(بقرہ:۲-۲۷۵،۲۷۶)

حرام کیا ہے، تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا تو اس کا ہے جو پہلے دیا گیا اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہیں، وہ دوزخ میں رہیں گے، خدا سود کو مٹاتا اور صدقہ وخیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہ گار کو پیار نہیں کرتا۔

قیامت میں سود خوار کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی، دنیا میں سود خواروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انہیں کسی کارِ خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے، آیت کے آخیر میں اللہ تعالیٰ نے سود خواروں کو ناشکر گنہ گار ٹھہرایا ہے، کیوں کہ خدا نے جو دولت ان کو دی تھی، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کار خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے، مگر انہوں نے اس کے بہ جائے غریبوں کو اور لوٹا اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے، جیسے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ، اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرض داروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا تو اس پر یہ آیتیں اتریں، جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا

اے ایمان لانے والو! خدا کا خیال کرو اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو، اگر تم واقعی مومن ہو، تو اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لئے ہشیار ہو جاؤ اور اگر تم باز آؤ تو تمہارے لئے تمہارا اصل سرمایہ ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے اور اگر وہ (مقروض) تنگ دست ہو تو اس کو کشادگی تک مہلت دو اور معاف کر دینا تمہارے لئے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو اور اس دن سے ڈرو جس میں تم خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر

كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (بقرہ:۲-۲۷۸تا۲۸۱)

ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان کا کچھ دبایا نہ جائے گا۔

ان آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب خدا کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا، اس کا حساب ہوگا، تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا، تو خدا کے یہاں پورا پورا مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کردینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے، جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے، تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں، تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے اور اسی طرح جب تک وہ قرض نہ ادا کردیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہوجاتا، خدا نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ.

(آل عمران:۳-۱۳۰،۱۳۱)

اے ایمان والو! (اصل سے) دوگنا چوگنا سود مت کھاؤ اور خدا سے تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاح پاؤ، اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ سودخواری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک رویائے صادقہ میں سودخواروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے، فرمایا میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے، اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لئے کنارہ کھڑا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ آنا چاہتا ہے، تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سودخوار ہے(۱)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجنائز بابٌ بعد ما قیل فی اولاد المشرکین ج۱ص۱۸۵ اور کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح ص۱۰۴۴۔

سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں، سودخوار آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے، تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے اور جو پھر لقمۂ تر بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے، تو وہ وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں، جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی (۱)۔

(۱) ابوداؤد کتاب البیوع باب فی آکل الربا وموکلہ ج ۲ ص ۴۷۳۔

شراب خواری

شراب خواری ان عاداتِ ذمیمہ میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں، اسلام سے پہلے جو مذہب تھے ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے، (۱) لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے، شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی، شراب پینا، پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، بی بیاں شوہروں (۲) اور چھوٹے اپنے (۳) بزرگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے، جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے (۴) اور ساتھیوں کو اس کے کباب لگا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے، ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کئے جاتے، ان کو سب مل کر آپ کھاتے اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی، پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں، خدا نے تم کو کھجور اور انگور دئے جو بہت بڑی نعمت ہیں، لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو، فرمایا:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ	اور کھجور اور انگور کے میوے دئے، تم ان سے نشہ بناتے ہو،
سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ	اور اچھی روزی، اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو
يَّعْقِلُوْنَ. (نحل:۱۶-۶۷)	سمجھتے ہیں۔

(۱) لوقا: ۱-۱۵ (۲) سبعہ معلقہ میں قصیدہ عمرو بن کلثوم الاھبی بصحنک ص ۱۰۴ (۳) صحیح بخاری کتاب الاشربۃ باب من رأی ان لا یخلط البسر والتمر ج ۲ ص ۸۳۸ (۴) سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ ص ۶۰ و مابعد اور صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۷۱ واقعہ حضرت حمزہؓ۔

اس آیت میں نشہ کو "رزق حسن" کے مقابلہ میں رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ "رزقِ حسن" (۱) نہیں، ان آیتوں میں میرے نزدیک درحقیقت خیر وباطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں، (۲) اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے، کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک وصاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے، کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک، اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

مدینہ میں آکر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء:۴-۴۳)	تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ:۲-۲۱۹)	(اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوے کے بارہ میں پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے لئے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریحِ طبع کا لطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہیں، دوسروں کو بھی ان کے بہ دولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے، لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں، اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے، لیکن چوں کہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا، اس لئے اس کے فائدے کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے، آخر یہ آیت اتری:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. اِنَّمَا	اے ایمان والو! شراب اور جوا اور چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے کام ہیں شیطان کے، سو ان سے بچتے رہو، شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے

---

(۱) تفسیر کبیر امام رازی تفسیر سورہ نحل ج ۴ ص ۱۵۹ وما بعد (۲) مفسرین کی مختلف رائیں ہیں۔

یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّوۡقِعَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃَ	آپس میں شراب اور جوے سے دشمنی اور بیر ڈال دے،
وَالۡبَغۡضَآءَ فِی الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ وَیَصُدَّکُمۡ عَنۡ	اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، پھر اب تم
ذِکۡرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَہُوۡنَ۔	باز آتے ہو۔

(مائدہ:۵-۹۰،۹۱)

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہؓ نے چلا کر کہا خداوندا! ہم باز آ گئے (۱) اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خم الٹے جا رہے تھے، اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی (۲)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیے ہیں، اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے، دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے، ان تینوں اسباب کی سچائی روزِ روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے یعنی شراب اور جوے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور برے کاموں میں سے شمار کیا ہے، اس لئے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں، اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مر گیا، تو فرمایا ھٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ (قصص:۲۸-۱۵) "یہ ہوا شیطان کے کام سے" یعنی بہت ہی برا کام ہوا، اسی طرح اس آیت اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ (بنی اسرائیل:۱۷-۲۷) "بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں" کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوے، بتوں کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے، کون نہیں جانتا، شراب خواری، قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے

(۱) ابوداؤد کتاب الاشربۃ باب تحریم الخمر ج۲ ص۱۷ ۵ (۲) صحیح بخاری کتاب الاشربۃ باب نزول تحریم الخمر ج۲ ص۸۳۶۔

خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے، جس کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں، ایک معاشرتی، اور دوسری مذہبی، معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گذرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے، کتنے قتل، کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کے بہ دولت روزانہ پیش آتے ہیں، مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہو جاتا ہے، بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے، قرآن نے اس کے لئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے، خمر کہتے ہیں چھا جانے کو، اس لئے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش کو چھالے، وہ خمر میں داخل ہے، حضرت عمرؓ نے منبر نبوی ﷺ پر کھڑے ہو کر فرمایا ''شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے'' (۱)، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے'' (۲) فرمایا ''جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی، وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا'' (۳)، آنحضرت ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے سامنے دستِ غیب نے دو پیالے رکھے، ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب، سرور کائنات ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا، ناموسِ وحی حضرت جبرئیلؑ نے کہا ''اس خدا کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی، اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی'' (۴)، گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے'' (۵)، یہ بھی فرمایا کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا'' (۶)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الاشربۃ باب الخمر من العنب ج۲ص۸۳۶ (۲) صحیحین بخاری کتاب الاشربۃ باب الخمر من العسل ج۲ص۸۳۷ (۳) ایضاً بخاری باب قول اللہ انما الخمر الخ ص۸۳۶ (۴) ایضاً بخاری باب شرب اللبن ج۲ص۸۳۹ (۵) صحیحین کتاب الاشربۃ بخاری باب قولہ تعالیٰ انما الخمر الخ ج۲ص۸۳۶ (۶) ایضاً باب قول اللہ انما الخمر ج۲ص۸۳۶۔

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سدِ ذرائع کے طور پر حرام کیے، یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہوگئے تو اس سختی کو اٹھادیا(۱)۔

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے کہ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ:۵-۲) ''گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو'' کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا سب حرام ٹھہرایا گیا، فرمایا ''خدا نے شراب پر، اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لئے نچوڑنے والے، اپنے لئے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے سب پر لعنت فرمائی ہے'' (۲) یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''ہر نشہ کی چیز حرام ہے، اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے'' (۳)۔

---

(۱) صحیحین کتاب الاشربۃ بخاری باب ترخیص النبی ﷺ فی الادعیۃ ج۲ص۸۳۷ (۲) ابوداؤد کتاب الاشربۃ باب العصیر للخمر ج۲ص۵۱۷ (۳) صحیحین بخاری کتاب الاشربۃ باب الباذق ومن نہی عن کل مسکر ج۲ص۸۳۸ و مسلم کتاب الاشربۃ باب ان کل مسکر خمر ج۲ص۷۷ و ابوداؤد باب ماجاء فی السکر ج۲ص۵۱۸ و ترمذی باب ماجاء ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام ج۲ص۸ کتاب الاشربۃ۔

غیظ وغضب

غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بے دردانہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لئے ایک مسلمان کو چاہئے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ وغضب کا اظہار نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو دبالیتے ہیں، وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (آل عمران:۳-۱۳۴) اور دوسری جگہ فرمایا وَاِذَا مَاغَضِبُوْھُمْ یَغْفِرُوْنَ (شوریٰ:۴۲-۳۷) اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کردیتے ہیں، انسان کا سکون کی حالت میں معاف کردینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہوجاتا ہے، معاف کرنا آسان نہیں ہے لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کردے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے'' (۱)۔

حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابن عمرؓ، حضرت جاریہؓ بن قدامہ، حضرت ابودرداءؓ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، ارشاد ہوا کہ ''غصہ نہ کیا کرو'' اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی، تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی، آپ ﷺ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ ''غصہ نہ کیا کرو'' (۲) مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ حقیقت میں ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب ج۲ص۳۹۶ وبخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب ج۲ص۹۰۳ (۲) صحیح مسلم کتاب الادب باب الحذر من الغضب ص۹۰۳ وجامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب ج۲ص۲۲ ومسند احمد وابن حبان وطبرانی (منذری باب الترھیب من الغضب ج۲ص۱۶۱)۔

مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہؓ کو کھڑے ہوکر نصیحتیں فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی، فرمایا ”آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کئے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہوجاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے اور دور بھی جلد ہوجاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہوجاتی ہے اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے، تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور جلد ہوجائے اور ان میں سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو، ہاں! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو، اس کو چاہئے کہ وہ زمین سے لگ جائے“ (۱)۔

ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہئے کہ وضو کرلے“ (۲) حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہئے کہ بیٹھ جائے، اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہئے کہ لیٹ جائے (۳)۔

صحیحین میں ہے آنحضرت ﷺ کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہوگئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہوگیا اور رگیں پھول گئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا، پھر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کہے (۴)۔

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ	معاف کرنے کی عادت ڈال، نیکی کی بات کہہ اور نادانوں
وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ	سے درگذر کر اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھار دے، تو اللہ
اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. (اعراف: ۷-۱۹۹ تا ۲۰۰)	کی پناہ پکڑ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

(۱) جامع ترمذی (منذری باب مذکور) (۲) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب ما یقال عند الغضب ج ۲ ص ۶۶۰ (۳) ایضاً ص ۶۵۹ (۴) صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب ج ۲ ص ۹۰۳ و مسلم کتاب البر والصلة والآداب باب فضل من یملک نفسه عند الغضب ج ۲ ص ۳۹۶۔

اسی قسم کی آیت سورہ حٰمٓ السجدہ (۴۱-۳۴ تا ۳۶) میں بھی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہوگی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دوست رشتہ والا اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے''

آنحضرت ﷺ نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چوں کہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہئے کہ خداوندا! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں، (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرلے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیلِ ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے، اس سے منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

☆

بغض وکینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیرپا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (حشر:۵۹-۱۰)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے معاف کر اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ، اے ہمارے پروردگار تو نرمی والا مہربان ہے۔

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے آپس میں بھائی بھائی ہوں گے، وہاں بغض وکینہ کا گذر نہ ہوگا، فرمایا:

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ۔ (حجر:۱۵-۴۷)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ (اعراف:۷-۴۳)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔

ان آیتوں کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا جنت کا تخت ہاتھ نہ آئے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہئے، فرمایا:

"اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، کسی بھائی کے لئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے"(۱)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر ج۲ص۸۹۶ و مسلم کتاب البر والصلة والآداب باب النھی عن التحاسد والتباغض والتدابر ج۲ص۳۸۰ و مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی المھاجرة ص۳۶۵، ابوداؤد کتاب الادب باب فی ھجرة الرجل اخاه ج۲ص۶۷۲، ۶۷۳، ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی الحسد ج۲ص۱۵، نسائی۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے، ابوایوبؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے، دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیرے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے" (۱) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے، تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آ کر ملے، پھر سلام کرے تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا" (۲)، کئی حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ہر دوشنبہ اور پنج شنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں، تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہیں کیا خدا اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے، تو خدا فرماتا ہے، کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو، میل کر لیں" (۳) اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا "دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں، تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی اس کو مغفرت دی جاتی ہے اور جس نے توبہ کی ہوگی، اس کی توبہ قبول ہوتی ہے لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب لوٹا دئے جاتے ہیں، جب تک وہ اس سے باز نہ آئیں" (۴) یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی بخشایش نہیں، ان میں سے ایک وہ جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے (۵)۔

---

(۱) مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی المهاجرة ص ۳۶۵، بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفة وغیر المعرفة ج ۲ ص ۹۲۱، مسلم کتاب البر والصلة باب تحریم الهجر فوق ثلاث ج ۲ ص ۳۸۱، ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی کراهية الهجر للمسلم ج ۲ ص ۱۵، ابوداؤد حوالہ سابق ص ۶۷۳ (۲) سنن ابی داؤد حوالہ سابق (۳) مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی المهاجرة ص ۳۶۵ و مسلم کتاب البر والصلة باب النهی عن الشحناء ج ۲ ص ۳۸۲، ابوداؤد حوالہ سابق ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی المتهاجرین ج ۲ ص ۲۲، ترمذی میں تفتح ابواب الجنة کا لفظ ہے، "ض" وادب المفرد بخاری باب الشحناء ص ۸۲ (۴) طبرانی فی الاوسط (منذری ۲ ص ۱۶۴ مصر) (۵) ادب المفرد بخاری باب الشحناء ص ۸۲۔

ان حدیثوں پر غور کیجئے ،شرک اورکینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے،دین دو چیزوں سے عبارت ہے،اللہ کا حق اور بندوں کا حق ،جب تک شرک رہے گا اللہ کا کوئی حق ادانہیں ہوسکتا،اسی طرح جن دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادانہ کر سکے گا،غرض جس طرح شرک،حق اللہ سے مانع ہے،بغض وکینہ حق العباد سے باز رکھتا ہےاوران ہی دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، یہاں تک کہ کفر وشرک اور عصیان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں، قرآن میں اس کے لئے دو اور لفظ بغی (سرکشی) اور عدوان (تعدی) آئے ہیں، یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ (اعراف:۷-۳۳)

کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ (نحل:۱۶-۹۰)

اور خدا بے حیائی اور ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے، جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن وامان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بہ قدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لئے دی گئی تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ. وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ:۴۲-۳۹)

اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کردے تو مظلوم اپنا

انصاف خدا کے ہاں پائے گا اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہے گا:

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ. (شوریٰ: ۴۲-۴۰)

پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی:

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ. (شوریٰ: ۴۲-۴۱)

اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔

ملامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. (شوریٰ: ۴۲-۴۲)

راہ ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں، ان کے لئے دکھ والی سزا ہے۔

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلب قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا. (اسرائیل: ۱۷-۳۳)

اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے، بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہئے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگین کریں، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے، اس کے دو فائدے ہیں، ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا. (نساء: ۴-۱۴۸)

اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگوں کریں:

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ. (حجرات:۴۹-۹)	تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آوے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی، لیکن اگر فریقِ مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، فرمایا:

وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ. (مائدہ:۵-۲)	اور کسی قوم کی دشمنی اس لئے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک وہ سخت سزا والا ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا موثر حربہ جس کا نام آج کل عدمِ تعاون اور نان کوآپریشن ہے، اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم وتعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہوا جائے، البتہ اس عدمِ شرکت کی صورتیں زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ''تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم'' صحابہؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیوں کر کی جائے، فرمایا ''اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے''(۱) اس طریقۂ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالئے، ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے

(۱) صحیح بخاری ابواب المظالم والقصاص باب عن اخاک ظالما او مظلوما ج ۱ ص ۳۳۱ و صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب نصر الاخ ظالمًا او مظلومًا ج ۲ ص ۳۸۸۔

والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کردی اور جب بہ ظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بہ دل وجان متوجہ ہوگئے، تو اس کمالِ التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ یہ حدیثِ قدسی بڑے مؤثر انداز میں سنائی، فرمایا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ ”اے میرے بندو! میں نے اپنے لئے اور تمہارے لئے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے، تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو“ (۱)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا“ (۲) ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو، کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہوجائے گا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہوکر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھا پن قیامت کے دن ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے“ (۳)، براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے (۴)، حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ ﷺ نے یمن بھیجا تو ان کو نصیحت فرمائی کہ ”مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیوں کہ اس کے اور خدا کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں“ (۵)، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہئے کہ آج ہی اس سے پاک ہولے،

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب تحریم الظلم ج۲ص۳۸۶ و ترمذی کتاب الزھد و مسند احمد ج۵ (ص۱۵۴ و ۱۶۰ و ۱۷۷ و ادب المفرد بخاری ابواب المظالم والقصاص باب الظلم ظلمات ج۱ص۳۳۱ (۲) صحیح مسلم باب تحریم الظلم ج۲ص۳۸۷ و صحیح بخاری ابواب المظالم والقصاص باب الظلم ظلمات یوم القیامة ج۱ص۳۳۱ (۳) صحیح بخاری ابواب المظالم باب لایظلم المسلم المسلم ج۱ص۳۳۰ (۴) ایضاً باب نصر المظلوم ج۱ص۳۳۱ (۵) صحیح بخاری ابواب المظالم باب الاتقاء والحذر من دعوة المظلوم ج۱ص۳۳۱۔

اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہوگا نہ درہم، ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی" (۱)

فرمایا کہ "ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں" (۲)۔

فرمایا اہلِ ایمان دوزخ سے پاک ہوچکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے، وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر جو ظلم کئے تھے ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی پاک ہوجائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی (۳)۔

---

(۱) صحیح بخاری ابواب المظالم باب الاتقاء والحذر من دعوۃ المظلوم ج۱ص۳۳۱۔ (۲) صحیح مسلم باب تحریم الظلم ج۲ص۳۸۸ (۳) صحیح بخاری ابواب المظالم باب قصاص المظالم ج۱ص۳۳۰۔

فخر وغرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اورلوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا، یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں، دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ (اعراف: ۷-۱۲) میں اس سے بہتر ہوں، وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، خداتعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا اور فرمایا فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (اعراف: ۷-۱۳) یہاں سے اتر جا، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔

کبر وغرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے، جس کے لئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو، تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا ''نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے'' (۱)۔

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنادیا، پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو اورلوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے:

---

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر ج۲ص ۵۶۶۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا فَھَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ (ابراہیم:۱۴-۲۱)

اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے رو بہ رو نکل کھڑے ہوں گے،تو (جولوگ دنیا میں) کمزور تھے(اس وقت)ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے،کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بہ قدم چلنے والے تھے،تو کیا (آج) تم عذاب خدا میں سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اوراس کے اعیانِ دولت کے پاس بھیجا،لیکن انہوں نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے:

فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ. (مومنون:۲۳-۴۶)

تو وہ سب شیخی میں آگئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔

اسی تکبر کی بناپر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو،اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے،ان کو اس سے ننگ وعار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ مَا نَرٰکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ. (ھود:۱۱-۲۷)

اس پر ان کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے، لگے کہنے کہ ہم کو تو تم ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذالے ہیں،(اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی،قومی،سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے،اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے،تا کہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیشِ نظر ہو جائیں، عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں،بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ. (ص:۳۸-۲) لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی) ہیکڑی اور مخالفت میں (پڑے ہیں)۔

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار اختیار کیا ہے:

کَذٰلِکَ یَطۡبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ قَلۡبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ. (مومن:۴۰-۳۵) جتنے مغرور اور سرکش ہیں اللہ ان کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔

دو موقعوں پر اس کے لئے مختال کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرًا. (نساء:۴-۳۶) اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡتَکۡبِرِیۡنَ. (نحل:۱۶-۲۳) اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان کو جہنم کی خوش خبری بھی یہیں دے دی گئی ہے:

اَلَیۡسَ فِیۡ جَہَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡمُتَکَبِّرِیۡنَ. (زمر:۳۹-۶۰) کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانہ نہیں۔

فَبِئۡسَ مَثۡوَی الۡمُتَکَبِّرِیۡنَ. (زمر:۳۹-۷۲) تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانہ ہے۔

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لئے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا، اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا(۱) اور امام غزالیؒ نے اس حدیث کا یہ

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر ج۲ص۵۶۶۔

فلسفہ بیان کیا ہے کہ ”مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا“ یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

یہ بداخلاقی چوں کہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے نتائج گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لئے ان سب کا استقصا تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دئے ہیں، مثلاً کبر و غرور کے جو مظاہر امرا و سلاطین سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں، اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہئے“ (۱) ایک بار آپ ﷺ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابۂ کرامؓ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، فرمایا کہ عجمیوں کی طرح تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوا کرو (۲)۔

بڑے آداب والقاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا، اگر وہ خلافِ واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں، عجمی بادشاہ اپنے کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”سب سے برا نام خدا کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے“ (۳)۔

کبر و غرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے، مثلاً:

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا. (بنی اسرائیل: ۱۷-۳۷)	اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر، کیوں کہ (اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔
وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمان: ۳۱-۱۸)	اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل، بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو، فخار ہو۔

گنہ گار کی شان یہ بیان کی ہے:

---

(۱) و (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب الرجل یقوم للرجل یعظمہ ج ۲ ص ۱۷۰ (۳) صحیح بخاری کتاب الادب باب البغض الاسماء الی اللہ تعالیٰ ج ۲ ص ۹۱۶۔

ثانی عطفہ　　(حج: ۲۲-۹)　　اینٹھتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة(۱)	جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا خدا اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ گذشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو خدا نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے (۲) اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع و خاکساری پر دلالت کرتے ہیں اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا. (فرقان: ۲۵-۶۳)	اور (خدائے) رحمان کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔

رسول اللہ ﷺ دو زانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا، اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے، فرمایا "خدا نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے، متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے (۳)۔

ایک صحابیؓ نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں، حالاں کہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں، کمّل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ "جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا" (۴)۔

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں: حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، قوت اور اعوان و انصار کی

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار ص۵۶۴ (۲) ترمذی ابواب الزهد (ابواب صفة القيامة باب ج۲ ص۷۵ (۳) ابن ماجہ کتاب الاطعمہ باب الاکل متکئا ص۲۴۲ (۴) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی الکبر ج۲ ص۲۰۔

کثرت، اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کردی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر وغرور کا ذریعہ نہیں۔

عربوں کے فخر وغرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب ونسب کی برتری کا خیال تھا، اس کو یہ کہہ کر مٹا دیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (حجرات: ۴۹-۱۳)	لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں، تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔

اس کے بعد بتایا کہ شرافت وعظمت کی بنیاد نسب وحسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (حجرات: ۴۹-۱۳)	اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا کہ ”خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیزگار اور بدکار بدبخت، تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں، جو جہنم کا کوئلہ ہیں، یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے“ (۱)۔

جہاں تک زیب وزینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے، حسن وجمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوب رو شخص نے جب آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتا عمدہ ہو تو فرمایا کہ ”خدا حسن کو پسند کرتا ہے“ (۲) یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن وجمال، غرور وتکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، چنانچہ ایک صحابیؓ کو آپ ﷺ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں، جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہ بند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ، کیوں کہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا (۳)۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی التفاخر بالاحساب ص ۶۹۸ (۲) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر ج ۲ ص ۲۰ (۳) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار ص ۵۶۴۔

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی، مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنا لیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (حدید:۵۷-۲۰)

(لوگو!) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور ظاہری طمطراق اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواست گار ہونا (بس یہی کچھ ہے)۔

احادیث میں مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے، حالاں کہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا، آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالاں کہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا اور پہن کر پھاڑ ڈالا (۱)۔

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیے جاسکتے ہیں، اس لئے اس قسم کے موقعوں پر وہ ایک قابلِ ستائش وصف ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کو ''قوی امین'' کہا ہے اور حضرت لوطؑ نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے:

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ. (ھود:۱۱-۸۰)

(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی، یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ پاتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوعِ انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے:

---

(۱) ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزھادۃ فی الدنیا ج۲ص۶۰۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً (روم:۳۰-۵۴)

اللہ (ہی) وہ (قادر مطلق) ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا، پھر (طفلی کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔

اور مسلمانوں کو طاقت ور بننے اور سامان جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال:۸-۶۰)

اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہوسکے کافروں کے (مقابلہ کے) لئے سازوسامان مہیا کئے رہو، کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھوگے اور نیز ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ طاقت ور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے(۱) اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے، تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں بلکہ تواضع وخاک ساری کی فضیلت ہے، جو ایک قابلِ ستایش وصف ہے، اسی بناپر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر وغرور کے ساتھ کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

الا اخبرکم باھل الجنة کل ضعیف مستضعف الا اخبرکم باھل النار کل عتل جواظ متکبر (۲)

کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں، کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص۔

دوسری حدیث میں ہے:

احتجت النار والجنة فقالت ھذہ یدخلنی الجبارون المتکبرون وقالت ھذہ یدخلنی الضعفاء والمساکین (۳)

دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا، دوزخ نے کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوئے اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔

---

(۱) مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز ج۲ص۴۱۵ (۲) بخاری کتاب الادب باب الکبر ج۲ص۸۹۷ (۳) مسلم کتاب الجنة وصفة نعیمها باب النار یدخلها الجبارون ج۲ص۳۸۲۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ضعف بجائے خود قابلِ مدح وصف نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاک ساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے۔

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لئے ایک ما بہ الامتیاز چیز رہی ہے، بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر وغرور کرتی ہیں اور اس فخر وغرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں، بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہیں، زمانۂ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا، جس کو اپنی دولت اور اعوان وانصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی، وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے:

اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا.	میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور (میرا) جتھا (بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہے۔
(کہف:۱۸-۳۴)	

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لئے اس قدر کبر وغرور جائز نہیں:

اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًا.	کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا، پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔
(کہف:۱۸-۳۷)	

نتیجہ یہ ہوا کہ عذابِ الٰہی نے اس کی دولت کو ملیا میٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا، اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائیدار چیز فخر وغرور کے قابل نہیں، اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور زندوں سے گذر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر وغرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لئے ایک خاص لفظ تکاثر ایجاد ہو گیا تھا، جس نے ان کو دینی امور سے غافل وبے پروا کر دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسانوں کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ. حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ.	تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔
(تکاثر:۱۰۲-۱،۲)	

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کردینے کے قابل نہیں، بلکہ اجتماعی وتمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابل فخر چیز ہے، بشرطے کہ فخر وغرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم(۱)	محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو، کیوں کہ کثرت تعداد میں میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔

آج تعداد کی اسی اقلیت واکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

☆

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار ص ۲۸۰۔

ریا

ریا کے لغوی معنی دکھاوا اور نمایش کے ہیں، انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لئے اعمال کی راستی اور ناراستی اور اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، صحیح حدیثوں میں ہے کہ انما الاعمال بالنیات (۱) عمل نیت سے ہے اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے، نمایش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی اور برائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسنِ ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیوں کہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں، اسی لئے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی برائی بیان کی ہے، جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمایش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو، فرمایا:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ (انفال:۸-۴۷)

اور ان (کافروں) جیسے نہ بنو جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

یہ ریا اور نمایش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے، جو خالصتاً لوجہ اللہ نہ کیا جائے، بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو، اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر رکھا ہے، کیوں کہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے، اسی لئے خدا فرماتا ہے:

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ (فرقان:۲۵-۴۳)

کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

---

(۱) بخاری ابتدا باب کیف کان بدء الوحی ج ۱ ص ۲۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں، تو جو شخص میرے لئے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کر لے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسی کے لئے ہے، جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے“ (۱)۔

ایک صحابیؓ روایت کرتے ہیں، کہ قیامت کے دن جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو خدا کے لئے کیا گیا ہے، کسی اور کو شریک کر لیا ہے، وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے، کیوں کہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے (۲)۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگے گی، بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگوں کے لئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی (۳)۔

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عملِ خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے، وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے، لیکن خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے، اس بناپر قرآن مجید میں جا بجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ:۲-۲۶۴)	مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور (سائل کو) طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے، پہلا مقصد چوں کہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے

(۱) و (۲) و (۳) سنن ابن ماجہ ابواب الزہد باب الریا والسمعۃ ص ۳۲۰۔

سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے وہ نہایت بے پروائی، غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں، اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مصنوعی خشوع وخضوع، للّٰہیت اور محویت واستغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عہد رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں، اس لئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں، اسی لئے ایسے شخص کے عمل میں للّٰہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا۔

(نساء:۴-۱۴۲)

منافق (مسلمانوں کو دھوکا دے کر گویا) خدا کو دھوکا دیتے ہیں، حالاں کہ (حقیقت میں) خدا ان ہی کو دھوکے میں رکھے ہے اور (یہ لوگ) جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، (ظاہرداری کر کے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر کچھ یوں ہی سا۔

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ۔ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ۔

(ماعون:۱۰۷-۴تا۶)

تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اور وہ جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہؓ مسیح دجال کا کر ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ آ نکلے اور فرمایا ”کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟“ صحابہؓ نے کہا ہاں، فرمایا شرکِ خفی اور یہ کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو اور اس کو زیب وزینت کے ساتھ ادا کرے، اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے“(۱)۔

چوں کہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی شکل وصورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور اپنی امت کو اس کی

(۱) سنن ابن ماجہ ابواب الزھد باب الریا والسمعۃ ص ۳۲۰۔

گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، بالخصوص عرب کے فضائلِ اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور لوگ محض نام و نمود کے لئے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے، اسلام نے صدقہ وخیرات کا حکم دیا تو اس بداخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لئے قرآن وحدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ وخیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس میں ریاکاری کی آمیزش نہ ہونے پائے:

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّاهِیَ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ (بقرہ:۲-۲۷۱)

لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے، (کہ اس میں نام ونمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا خدا سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا (۱)۔

عرب کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نام ونمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لئے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا، اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے، اس لئے وہ ریاکاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی، چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے، ایک شخص شہرت کے لئے اور ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لئے لڑتا ہے تو ان میں سے کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے، فرمایا ''اس شخص کا جو اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو'' (۲)۔

(۱) بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ بالیمین ج۱ص۱۹۱ (۲) مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ ج۲ص۱۳۹۔

آپ ﷺ سے سوال کیا جاتا ہے، کہ ایک شخص اظہار شجاعت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے، تو کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے، وہی پہلا جواب ملا (۱)۔

ریا کاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی، اس لئے اس میں ریا کاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی اس کے نتائجِ بد رسول اللہ ﷺ نے نہایت موثر طریقہ سے بتائے، ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم صرف اس لئے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے، اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ شخص لایا جائے گا، جس نے علم حاصل کیا، لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا، اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا، علم سکھایا اور تیرے لئے قرآن پڑھا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اس لئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ، پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں ان میں اپنا مال صرف کیا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ بکتے ہو، تم نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں، پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا (۲)۔

☆

(۱) مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ ج۲ ص۱۳۹ (۲) مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق بالنار ج۲ ص۱۳۹۔

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی، خودنمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس میں اور کبر میں فرق یہ ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے لیکن خود بینی کے لئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصافِ کمالیہ پر غلط ناز کر سکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں، اسی کا نام عجب اور خود بینی ہے، اسی سے نفس میں خودنمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے، خدا کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرتِ الٰہی نے ان کے پاؤں تھام لئے اور شکست فتح سے بدل گئی، خدا نے فرمایا:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا (توبہ:۹-۲۵)	اور حنین کے دن جب تمہاری کثرتِ تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کردی، تو اس تعداد کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔

اسی لئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو، بلکہ ان میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (انفال:۸-۴۷)	اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوش حالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق، ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ ۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (قصص: ۲۸-۵۸)

اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں، جب وہ اپنے گذران میں اترا چکیں۔

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی، یعنی قیامت آئے گی تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت ﷺ نے بتائی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی اور اسی پر ناز کرے گا اور اترائے گا اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے (۱)۔

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے، ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پرہیز گاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلّی کی ممانعت فرمائی ہے:

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى . (نجم: ۵۳-۳۲)

تو (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو، پرہیز گاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ میں عجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ: ۵-۱۸)

اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ (جمعہ: ۶۲-۶)

(اے پیغمبران یہودیوں سے) کہو کہ اے یہود اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے چہیتے ہو۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الملاحم باب الامر والنہی ج ۲ ص ۵۹۷۔

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب وخود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہوجاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہ تھی لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہوجاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے، حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کررہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''تم نے اس کو ہلاک کردیا'' (۱)، ایک بار آپ ﷺ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم نے اس کی گردن کاٹ لی، اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں'' (۲)، مدح کی یہ ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عجب وخود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور عطیہ سمجھے، اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا:

لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ (حدید: ۵۷-۲۳) خدا نے جو دیا ہے، اس پر اتراؤ نہیں۔

---

(۱) و (۲) بخاری کتاب الادب باب مایکرہ من التمادح ج۲ ص۸۹۵۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چوں کہ اسلام عرب میں آیا اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لئے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، کیوں کہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر وغرور اور نمایش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے اور ان بداخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

اہلِ عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا میں جو کچھ جیتتے، نشہ کے رنگ میں اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے، جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار بہ کثرت ہیں، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا (۱)۔

اہلِ عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر وغرور اور نام ونمود پر قائم تھی اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی، اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال ودولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لئے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا، تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے اور نمایش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے، اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا:

---

(۱) ابوداؤد کتاب الضحایا باب ماجاء فی اکل معاقرۃ الاعراب ج ۲ ص ۳۸۹۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا. اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا.

(اسرائیل:۱۷-۲۶و۲۷)

اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بے جا مت اڑاؤ، (کیوں کہ دولت کے) بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

آیت کے اخیر ٹکڑے سے ثابت ہے کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہے، امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”بعض علما کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہلِ عرب کی عادت کے موافق ہے، کیوں کہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر وغرور کے حاصل کرنے کے لئے صرف کرتے تھے“ (۱)۔

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی وغم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ فیاضی بخل واسراف کے درمیان کا نام ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہی دست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے، بلکہ الٹے تم ہی کو لوگ قابلِ ملامت ٹھہرائیں گے:

وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا.

(بنی اسرائیل:۱۷-۲۹)

اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے، اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے، (اور) تم تہی دست بھی ہوگے۔

چوں کہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا. (الفرقان:۲۵-۶۷)

اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا ہو۔

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی کو پسند کرتا ہے اور کھانے پینے، پہنے

(۱) تفسیر کبیر بھامشہ تفسیر ابی السعود ج۵ ص ۵۷۷۔

اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہئے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہئے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورۂ اعراف میں خدا فرماتا ہے:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ.

اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

(اعراف: ۷-۳۱)

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں، مگر اس میں بھی بعض مفسروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں:

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ.

درخت کے پھل سے جب وہ پھلے تم کھاؤ اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(انعام: ۶-۱۴۲)

☆

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت، یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بداخلاقی نہیں، بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیوں کہ عہدِ رسالت میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی، جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (نساء:۴-۵۴)	یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جلے مرتے ہیں۔

اور ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ (بقرہ:۲-۱۰۹)	(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنادیں۔

حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں:

۱- یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے، گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے، یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہو جائیں:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (نساء:۴-۸۹)	ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو،

(اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔

۲- دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن چوں کہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اس کو مل نہیں سکتی، اس لئے بالعرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

۳- تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے، ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چوں کہ زوالِ نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لئے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَافَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ (نساء:۴-۳۲) اور خدا نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے، اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لئے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں، اسی لئے فرمایا:

وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ (نساء:۴-۳۲) اور خدا سے اس کا فضل مانگو۔

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں، بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں۔

حسد کے سات اسباب ہیں:

۱- بغض وعداوت، کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں، اس لئے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی، وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی:

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (آل عمران:۳-۱۱۸)

چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے، دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو ہی چکی ہے اور (غیظ وغضب) جو ان کے دلوں میں (بھرے) ہیں، وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں:

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (آل عمران:۳-۱۲۰)

(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

بغض وعداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے مساوات شرط نہیں، بلکہ ایک ادنا آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہوسکتا ہے۔

۲- حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیوں کہ امثال واقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گذرتا ہے اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے، تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

۳- حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع ومنقاد بنانا چاہتا ہے، اس لئے جب وہ کسی شرف وامتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے، تاکہ وہ اس کا مطیع ومنقاد ہوسکے، کفارِ قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے:

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (انعام:۶-۵۳)

کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔

حسد کا یہ سبب اکابر واشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لئے کبر وغرور اور دوسروں کی تحقیر وتذلیل لازمی ہے۔

۴- حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے، تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں، کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے، اور تعجب سے کہتے تھے:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل:۱۷-۹۴)

کیا خدا نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے۔

۵-حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوجاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہوجاتا ہے، ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی، اس کا سبب یہی تھا:

اِذْقَالُوْا لَیُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓی اَبِیْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ (یوسف:۱۲-۸)

جب یوسف کے (بے مات) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے، تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (ابن یامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔

۶-حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لئے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہیں جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہیم ہوگیا ہے تو یہ ان کو سخت گراں گذرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہوگیا ہے، وہ اس سے چھن جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لئے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہلِ عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا، اس لئے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہوگئے، منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کردیا، اس لئے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا(۱)۔

۷-حسد کا ساتواں سبب خبثِ نفس اور بدطینتی ہے، کیوں کہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے، اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لئے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

---

(۱) بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیه اخلاط من المسلمین والمشرکین ج۲ص۹۲۴۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لئے بے گانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں باہم ربط واشتراک ہوتا ہے۔

ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لئے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم وعبادت مشترک ہے، اس کے بہ خلاف ایک عالم یا عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا، کیوں کہ ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالم گیر اشتراک پیدا کر دیا تھا، اس لئے ان میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہوسکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب ومراتب ہیں وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہوسکتے تھے، اس لئے اصولاً جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ برہم کرسکتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولاتحسسوا ولاتجسسوا ولاتحاسدوا ولاتدابروا ولاتباغضوا وکونوا عباد اللہ اخوانا(۱)

بدگمانی سے بچو کیوں کہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو، بلکہ اے خدا کے بندو! بھائی بھائی ہوجاؤ۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے:

المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقۃ والرحمۃ والمحبۃ والمواساۃ والمعاونۃ والنصیحۃ(۲)

اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم اور شفقت، غم خواری، محبت، اعانت اور خیر خواہی میں نسبی بھائیوں کی طرح ہوجاؤ۔

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے، جب ان تمام بداخلاقیوں سے احتراز کیا جائے، ورنہ اس کے بہ جائے دشمنی پیدا ہوجائے گی اور یہ اور اس قسم کے تمام محاسنِ اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہیں، یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، فنا ہوجائیں گے، چنانچہ حافظ

(۱) بخاری کتاب الادب باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر ج۲ ص۸۹۶ (۲) فتح الباری کتاب الادب باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر ج۱۰ ص۴۰۳۔

ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

کانہ قال اذا ترکتم ھذہ المنھیات کنتم اخوانا ومفھومہ اذالم تترکوھا تصیروا اعداء ومعنی کونوا اخوانا اکتسبوا ماتصیرون بہ اخوانامما سبق ذکرہ وغیر ذٰلک من الامور المقتضیۃ لذٰلک نفیا واثباتا (۱)

گویا رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دو گے، تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے، اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو جن کی وجہ سے بھائی بھائی بن جاؤ اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر گذرا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً یا اثباتاً پیدا کرتے ہیں۔

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیوں کہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بہ مشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا، کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا، شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ (۲) لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسنِ اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ شرارہ خرمنِ اسلام کو پھونک کر خاکِ سیاہ کر دے گا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب (۳)

تم لوگ حسد سے بچو کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ (فلق: ۱۱۳-۵)

اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرے۔

☆

---

(۱) فتح الباری کتاب الادب باب ماینھی عن التحاسد ج ۱۰ ص ۴۰۳ (۲) مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری کتاب الادب باب ماینھی عن التحاسد ج ۱۰ ص ۴۰۲، مصر (۳) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحسد ج ۲ ص ۶۷۲۔

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اسی کے مرتکب زیادہ تر رند، بے باک نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن وجمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس قسم کے حالات وواقعات بیان کئے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرم ناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت میں:

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ:۲-۱۹۷)	حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔

اسی کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن زمانۂ حج کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کئے جاسکتے ہیں، حالاں کہ یہ زمانہ صرف ذکرِ الٰہی کا ہوتا ہے، ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور مردوں کے ایک (۱) مجمع میں خطبہ دیا، اور حمد وثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے، تو دروازہ بند کرلیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح خدا کے پردے میں چھپ جاتا ہے؟ لوگوں نے کہا ''ہاں'' پھر فرمایا کہ ''اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا میں نے یہ کیا'' اس پر سب لوگ خاموش ہو رہے، پھر عورتوں کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ ''کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟'' اس پر ایک عورت نے دوزانو بیٹھ کر کہا کہ ''ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں'' فرمایا ''تم لوگ

(۱) دونوں کی نشستیں الگ تھیں۔ ''س''۔

جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی، حالاں کہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے'' (۲)۔

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے، اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدودِ الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے، ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اپنی اہمیت کھودیں گی اور قول عمل کے لئے ایک دن راستہ صاف کردے گا، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لئے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز واستعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے، تاکہ مدعا ظاہر ہو اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے، چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز واستعارہ ہی کے پردے میں بیان کئے گئے ہیں مثلاً:

وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (نساء:۴-۲۱) حالاں کہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بیوی ہم صحبت ہو چکے)۔

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (نساء:۴-۴۳) یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے، اسی لئے اس نے جماع کو کنایتاً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لئے اور جو الفاظ پیدا کئے ہیں جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں، گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں، لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنایے اور استعارے ہیں، اسلامی تعلیمات کے مطابق پاخانہ، پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرم ناک امراض کا ذکر بھی کنایتاً کرنا چاہئے، پاخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث میں ''قضائے حاجت'' کا لفظ مستعمل ہے، جو ایک کنایہ ہے، قرآن مجید میں اس کے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں:

اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (نساء:۴-۴۳) یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہوکر) آیا ہو۔

چوں کہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہیں اس لئے استعارتاً اس سے پاخانہ مراد لیا گیا۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابۃ اھلہ ج ۱ ص ۲۹۶۔

اس موقع پر یہ یادرکھنا چاہئے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پائیں خانہ ہے، چوں کہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں، اس لئے استعارتاً ان کو پائیں خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہوگیا، اوراب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے ''برص'' کی تعبیر ''سوء'' کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں:

وَاضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى. (طٰہٰ:۲۰-۲۲)	اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھلو (اور پھر نکالو) تو وہ بدون اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو، سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ (ہے)۔

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوت غضبیہ سے ہے جس کا نام سبّ وشتم یا گالی گلوج ہے اور یہ صورت عموماً جنگ وجدل کے موقع پر پیش آتی ہے، زمانۂ حج میں چوں کہ عام اجتماع ہوتا ہے اوراس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے ایک عام لفظ ''فسق'' سے اس کی ممانعت کی:

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ (بقرہ:۲-۱۹۷)	حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے، نہ فسق کی، نہ جھگڑے کی۔

گالی گلوج کی مختلف صورتیں ہیں، بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے، اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام میں مبتلا ہوتو اس پر بھی طنز کرتا ہے، بعض حالتوں میں اگراس نے کوئی برا کام کیا ہے، یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے، تو اس کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الۡجَهۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ (نساء:۴-۱۴۸)	اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (وہ ظلم کو برملا بیان کرسکتا ہے)۔

اور قرآن وحدیث میں جا بہ جا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

۱-ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوج میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں، یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے، اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اس لئے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے، خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نقطہ بیان کیا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّو	اور (مسلمانو!) خدا کے سوا دوسرے جن معبودوں کو یہ
اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ	پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو، کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے
(انعام:۶-۱۰۹)	بڑھ کر خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ ”سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے، کہا گیا یا رسول اللہ ﷺ کوئی اپنے باپ ماں پر کیوں کر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا ”اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہے گا“ (۱)۔

۲-بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا، آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ ”اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے“ لیکن جب وہ آپ ﷺ کے پاس بیٹھا تو آپ ﷺ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے، فرمایا ”عائشہؓ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا، جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں“ (۲)۔

۳-بدزبانی دورِ وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے، ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے (۳)، امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں (۴)۔

(۱) بخاری کتاب الادب باب لایسب الرجل والدیہ ج۲ص۸۸۳ (۲) ایضاً باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا متفحشا ج۲ص۸۹۱ (۳) ایضاً باب ماینهی من السباب واللعن ج۲ص۸۹۳،۸۹۴ (۴) ادب المفرد باب سباب العبید ص۳۹۔

۴- رفق وملاطفت اور شرم وحیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے، ایک بار کچھ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے السام علیکم (تم کو موت آئے) کہا، حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا "علیکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ علیکم" یعنی تم کو موت آئے خدا تم پر لعنت بھیجے اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ "اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو" (۱)۔

۵- گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا، ارشاد ہے کہ "بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے" (۲) اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

۶- گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے، حالاں کہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہئے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں (۳)، مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مردوں کے عزیز واقارب اور دوست واحباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے (۴)۔

۷- گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے، اس لئے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق تو ضرور ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا متفحشا ج۲ص۸۹۱ (۲) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی الفحش ج۲ص۱۸ (۳) مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام وای امورہ افضل ج۱ص۳۶ (۴) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی الشتم ج۲ص۱۹۔

سباب المسلم فسوق وقتاله كفر (۱)　　مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ليس المومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی (۲)　　جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا، لعنت نہیں بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے (۳)۔

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوج اور لعن وطعن سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں، مثلاً جب کوئی شخص حوادثِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانے کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے مشیتِ الٰہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے اور اس مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے کہ ''خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے، حالاں کہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں'' (۴) یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود خدا کو برا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف خدا کی فرماں بردار ہے'' (۵)۔

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ ﷺ نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا (۶) اور یہ اس عورت کی سزا تھی تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔

اسلام میں گالی گلوج کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں، بلکہ

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب ماینهی من السباب واللعن ج۲ص۸۹۳ (۲) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی اللعنة ج۲ص۱۸ (۳) بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق ج۱ص۱۰ (۴) بخاری کتاب الادب باب لاتسبوا الدهر ج۲ص۹۱۳ (۵) ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعن ج۲ص۶۷۲ (۶) ابوداؤد کتاب الجهاد باب النهی عن لعن البهيمة ج۱ص۳۴۶۔

ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دل آزاری ہوگالی ہے، کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگر چہ عرفِ عام میں گالی نہیں ہے، لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے، کیوں کہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی (۱)۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق یا کافر نہ ہوگا، تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گناہ گار ضرور ہوگا (۲)، بہر حال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبے میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ خدا نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام قرار دیا ہے جس طرح تمہارا یہ دن تمہارے اس مہینے اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب ماینھی من السباب واللعن ج۲ ص۸۹۳ و مسلم کتاب الایمان باب بیان حال ایمان من قال لاخیہ المسلم یا کافر ج۱ ص۴۳ (۲) فتح الباری کتاب الادب باب ما ینھی من السباب واللعن ج۲ ص۳۸۸۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے، ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بداخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جا سکتا ہے، جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے، مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورہ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں، اس لئے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور چوں کہ ان رذائل کے اخذ ورد میں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے، اس لئے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفۂ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق وعاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ان ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی برائی عدم صدق ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو، جھوٹ، غیبت، خلاف وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغل خوری، دورخاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں، دوسری اساسی برائی حبِ مال ہے، حبِ مال سے مقصود دنیا کے مال ودولت سے غیر معمولی محبت ہے، بخالت، حرص وطمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں، تیسری اساسی برائی حبِ ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے، حسد، تکبر، عجب، فخاری، غیظ وغضب، ظلم، کینہ، وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا، یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس، یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں، جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت میں آرام پائے گا:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی. فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی.

(نازعات:۷۹-۴۰،۴۱)

اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا تو جنت اس کی آرام گاہ ہے۔

☆

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے، کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جز ہیں، آداب کہلاتے ہیں، ان ہی آداب کی پابندی وعدمِ پابندی کے بہ دولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے، ان آداب میں خوبی ولطافت ملحوظ رکھنا حسنِ ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوش گواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کو بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہوجائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوب صورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلام علیہ السلام نے اپنی عملی وقولی ہدایات سے مسلمانوں کے لئے اس کا بہترین نمونہ قائم کردیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب وعوائد یعنی ایٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب وآئین یونان اور روم سے حاصل کیا، لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے، وہی اس کے آداب وعوائد کا ماخذ بھی ہے، اسی لئے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنادیتا ہے۔

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارمِ اخلاق سے الگ کردیا ہے اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح وسنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کرکے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فطری آداب

اسلام دینِ فطرت ہے، اس لئے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے، یعنی فطرتاً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیا علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے، یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں، تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا اور نکاح (۱) کرنا، ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا، یعنی سترِ عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے اور ختنہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ تورات کے بیان کے مطابق یہ خدا اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے (۲)۔

حضرت ابراہیمؑ انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں، ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے، جن کو خصالِ فطرت کہتے ہیں، امام بخاریؒ کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے (۳)، ایک حدیث ہے: ایک صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خصالِ فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرانا، موئے زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھ ترشوانا (۴)، ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں۔ مونچھ ترشوانا، داڑھی

(۱) ترمذی ابواب النکاح ابتداج اص ۲۰۶ (۲) توراۃ پیدائش باب ۱۷ آیات ۱۱و۱۲ (۳) باب الختان للکبیر ص ۲۳۰

(۴) صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب خصال الفطرۃ ج اص ۱۱۷۔

بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال بنوانا، موئے زیرناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا، غالباً کلی کرنی ہوگی (۱)۔

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں، چنانچہ وضو میں مسواک کرنا، مستحب، اور انگلیوں کا دھونا، ناک میں پانی ڈالنا، اور کلی کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھیں ترشوانا، صفائی کے ضروری لوازم ہیں، جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں، جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت معلوم ہوتی ہے، بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت کر صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلافِ فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔

مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے، مگر داڑھی بڑھانے کے بہ جائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے، یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے امت کے لئے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ'' (۲)، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ'' (۳) ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرت مند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے، اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے، جس رنگ کی عینک لگائے دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

☆

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب خصال الفطرۃ ج ۱ ص ۱۱۷ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب وشائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے، گو کہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی نسبتاً بہت کم تھا، پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، زن وشو کی ہم بستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کرلیں، نماز جو فرض ہے ادا نہیں ہوسکتی، فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (مائدہ:۵-۶) اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں، فرمایا:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. (مدثر:۷۴-۴) اور اپنے کپڑے کو پاک کر۔

اگر پاکی کے لئے پانی نہ مل سکے، یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہئے:

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (مائدہ:۵-۶) تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ منہ اور پاؤں دھولیں اور بھیگے ہاتھوں کو سر پر پھیرلیں، اس کا نام وضو ہے:

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ

وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ دھولو اور اپنے سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں دھوؤ۔

وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (مائدہ:۵-۶)

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت میں شریک ہوں، تاکہ کسی کی گندگی اور بدبوئی سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو، قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضوِ خاص ومقامِ خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے،

بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے، فرمایا:

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ (بقرہ:۲-۲۲۲) اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اسی طہارت کی پابندی، اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لئے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے، مثلاً:

ا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے، اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے، کیوں کہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے'' (۱) اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے، ہر حالت میں خیال رکھنا چاہئے، سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہوجائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا (۲)۔

ہاتھ کی صفائی پر اس لئے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کردے، اس لئے خیال رکھنا چاہئے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں، جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

۲۔ دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے، ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنت ٹھہرایا، فرمایا، اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا (۳)، ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے، جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے، تو فرمایا، کہ تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں، مسواک کیا کرو (۴)۔

۳۔ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہئے (۵)، یہ اس لئے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

۴۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں، ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسلِ جنابت بھی نہیں کرنا چاہئے (۶) بلکہ مجنب کو چاہئے کہ اس سے

(۱) مسلم کتاب الطھارۃ باب کراھۃ غمس المتوضئ وغیرہ یدہ الخ ج۱ص۱۲۲، ۱۲۳ (۲) ابوداؤد کتاب الطھارۃ باب فی الرجل یجد البلۃ فی منامہ ج۱ص۳۱ (۳) ایضاً باب السواک ج۱ص۷ (۴) مسند احمد ج۱ص۲۱۴ (۵) ابوداؤد کتاب الطھارۃ باب المواضع التی نھی عن البول فیھا ج۱ص۵ (۶) سنن ابی داؤد کتاب الطھارۃ باب البول فی الماء الراکد ج۱ص۱۰۔

پانی لے کر غسل کرے، کیوں کہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسرں کے لئے ناپاک یا قابلِ کراہت، بلکہ عام حالت میں خود اسی کی طبیعت کے لئے گھن پیدا کرے گا۔

۵۔ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے، اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

۶۔ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہئے، کیوں کہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

۷۔ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے، خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو، کیوں کہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی اور بدن کو ناپاک کریں گی یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

۸۔ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہئے، ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے ہاتھ دھو لینا اچھا ہے، استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے، اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

۹۔ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہئے (۱)۔

۱۰۔ ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے، بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگ دست اور پشمینہ پوش تھے اور محنت مزدوری کرتے تھے، ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی، جو چھپر کی تھی، ایک بار گرم دن میں رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے (۲) جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بدبودار چیز

---

(۱) یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ میں دیکھئے۔ (۲) ابوداؤد کتاب الطھارۃ باب الرخصۃ فی ترک الغسل یوم الجمعۃ ج ۱ ص ۵۱۔

مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی (۱)۔

۱۱۔ جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیے، چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں تو فرمایا کہ اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا، جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھولیتا (۲)۔

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت ونظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے، اس بنا پر اسلام نے بعض ان سختیوں کو دور کیا ہے، جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں، مثلاً یہودیوں کے مذہب کے رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لئے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو، لیکن اسلامی تعلیمات کے رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائیں، اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنواسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا، تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے، لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے، کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے (۳)۔

یہودیوں کے یہاں بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے، صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى	اور (اے پیغمبر!) لوگ تم سے حیض کے بارہ میں دریافت
فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ	کرتے ہیں، تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے، تو حیض

(۱) مسلم کتاب الصلوۃ کتاب المساجد ومواضع الصلوۃ باب نهى من اکل ثوما اوبصلا الخ ج۱ ص ۲۰۹، ۲۱۰

(۲) ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب وفی الخلقان ج۲ ص ۵۶۲ (۳) صحیح مسلم کتاب الطهارة باب المسح علی الخفین ج۱ ص ۱۲۰۔

حَتّٰی یَطْھُرْنَ فَاِذَا تَطَھَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ (بقرہ:۲-۲۲۲)

کے دونوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہولیں ان سے مقاربت نہ کرو اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔

اس کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ ﷺ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور آپ ﷺ کے سر کو دھوتی تھی، ایک بار آپ ﷺ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی، میں نے معذرت کی تو فرمایا، یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے(۱)۔

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جا سکتے، قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے، اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہؓ نے حالتِ جنابت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان نجس نہیں ہوتا'' (۲) یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں، یعنی زمین میں گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو، بولیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے (۳) یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے، ایک عورت نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے، وہ بدبودار ہے، جب بارش ہو تو ہم کیا کریں، فرمایا، کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں ہاں ہے، فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے (۴)، غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الطھارۃ (کتاب الحیض) باب جواز غسل الحائض رأس زوجھا ج۱ص۱۴۸ (۲) ابوداؤد کتاب الطھارۃ باب فی الجنب یصافح ج۱ص۳۰ (۳) ایضاً باب الاذی یصیب الذیل ج۱ص۵۵ (۴) ایضاً۔

پاک کرسکتی ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے پاک کردی گئی ہے اور اسی لئے وہ حالتِ تیمّم میں پانی کی قائم مقام ہوجاتی ہے، جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہوجاتا ہے۔

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمّم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کردیا (۱) اور اس کو تمام صحابہؓ نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھولئے جائیں، پھر کمر سے دھوکر نجاست دور کرلی جائے، پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے، آنحضرت ﷺ ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے، پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہاکر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے، پھر وضو کرتے، لیکن پاؤں نہیں دھوتے، پھر سر پر تین بار پانی بہاکر بال کی جڑوں کو ملتے، پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے (۲)۔

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہوسکتا تھا، لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لئے ہر روز نہالے تو مباح ہے، آنحضرت ﷺ پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں، کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہہ رہی ہو اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے (۳)۔

---

(۱) بیماری یا پانی نہ ملنے کی صورت میں (۲) صحیح مسلم کتاب الحیض باب صفة غسل الجنابة ج۱ص ۱۳۲،۱۳۳

(۳) صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب الصلوٰت الخمس کفارۃ ج۱ص ۷۶۔

کھانے پینے کے آداب

۱-کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھولینا چاہئے، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے، لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سوکر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے، اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں (۱) اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے (۲) ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا، اور اس کو اس کی تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہئے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لئے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

۲-مسلمانوں کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہئے، جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے کتنا بڑا کام ہے، یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہئے، اس لئے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ کر لینا چاہئے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ ﷺ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے (۳) اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ و اٰخرہ کہہ لے (۴)۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاطعمة غسل الید قبل الطعام ج۲ص ۵۲۸ (۲) ایضاً باب فی غسل الید من الطعام ج۲ص ۵۲۸ (۳) ابوداؤد کتاب الاطعمہ باب التسمیة علی الطعام ج۲ص ۵۲۸ (۴) ایضاً۔

۳-انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک وناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے، صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لئے خاص کردئے جائیں، چنانچہ سب اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کو اور دفعِ نجاست وغیرہ کے لئے بائیں ہاتھ کو خاص کردیا گیا ہے، اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے، انسان کے زیادہ تر کام فطرتاً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفعِ نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں، اس لئے زیادہ تر کاموں کے لئے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہیں ہے، یعنی دایاں پہلو، تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لئے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی چستی اور طاقت ہوتی ہے، اسی لئے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہئے (۱) صرف کھانے ہی پینے کی خصوصیت نہیں بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے، ایک بار آپ ﷺ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا، مجلس میں آپ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، آپ ﷺ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔ (۲)

ایک بار آپ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، اس نے کہا کہ میں آپ کا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا، مجبوراً آپ ﷺ نے پہلے اسی کو دیا۔ (۳)

۴-کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہئے، بیچ سے نہیں کھانا چاہئے، کیوں کہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے، اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔ (۴)

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاطعمة باب الاکل بالیمین ج ۲ ص ۵۳۰ (۲) صحیح بخاری کتاب الاشربة باب الایمن فالایمن فی الشرب ج ۲ ص ۸۴۰ (۳) ایضاً (۴) ترمذی ابواب الاطعمة باب ماجاء فی کراهیة الاکل فی وسط الطعام ج ۲ ص ۲۔

۵-اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں کھانا چاہئے (۱) کیوں کہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے، تا کہ کوئی دوسرا آ کر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھا لے، یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص و طمع پر دال ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہئے۔

۶-کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے، کیوں کہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فیہ نکالنے والے کی طرف سے چڑھ اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے، اس لئے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہئے، ورنہ چھوڑ دینا چاہئے۔(۲)

۷-سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسنِ معاشرت کا ذریعہ ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کو پسند فرمایا ہے، کہ دوست واحباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، الگ الگ کھانا بھی جائز ہے اور ایک ساتھ بھی (۳) لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے، اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا، کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی زیادہ کھاتا ہے، سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے، پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے مٹتا ہے، اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے، ایک بار صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے، فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو، صحابہؓ نے کہا ہاں! فرمایا ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ کر لو تو برکت ہوگی (۴)۔

---

(۱) سنن ترمذی ابواب الطعام باب الاقران فی التمر عند الاکل ج ۲ ص ۵۳۶ (۲) بخاری کتاب الاطعمة باب ما عاب النبی ﷺ طعاما قط ج ۲ ص ۸۱۴ (۳) نور: ۲۴-۶۱ (۴) ابوداؤد کتاب الاطعمة فی الاجتماع علی الطعام ج ۲ ص ۵۲۸۔

۸-کھانا ٹیک لگا کے بیٹھ کر یا منہ کے بل سو کر نہیں کھانا چاہئے (۱) کیوں کہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لئے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے آرام نہیں پہنچتی ہے، کھانے کے لئے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے، یا دوزانو بیٹھ کر اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر (۲) آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، میں بندہ ہوں، غلاموں کی طرح کھاتا ہوں، یعنی خاکساری سے۔ (۳)

۹-کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہئے، ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے، خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لئے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔

۱۰-کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہئے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پوچھنا چاہئے۔ (۴)

۱۱-پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہئے (۵) اس طرح پینے سے پوری سیری ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

۱۲-پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہئے (۶) کیوں کہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن میں پڑ جائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو، پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے، اس لئے اس سانس کو یا اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہئے۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاطعمۃ فی الاجتماع علی الطعام ج۲ ص۵۲۸ (۲) ابوداؤد کتاب الاطعمہ باب فی الاکل متکئاً ج۲ ص۵۲۹ وابن ماجہ کتاب اطعمۃ باب الاکل متکئا ص۲۴۲ وشرح سفر السعادۃ فصل فی طعامہ ص۸۷ مطبوعہ مطبعہ وہبیہ مصر ۱۲۹۵ھ فیروز آبادی للشیخ عبدالحق محدث دہلوی (۳) ابوداؤد وابن ماجہ مع زرقانی علی السیرۃ ج۴ ص۳۹۸ (۴) بخاری کتاب الاطعمۃ باب لعق الاصابع وباب المندیل ج۲ ص۸۲۰ (۵) بخاری کتاب الاشربۃ باب الشرب بنفسین او ثلاثۃ ج۲ ص۸۴۱ (۶) ابوداؤد کتاب الاشربۃ فی النفخ فی الشراب ج۲ ص۵۲۴۔

۱۳- پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہئے، کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے، اور طبی حیثیت سے مضر ہے، البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ ہرج نہیں کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے(۱) مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہئے، کیوں کہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے، البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔

۱۴- پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہئے، کیوں کہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا، پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں۔

۱۵- کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کے رکھنا چاہئے (۲) تا کہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے، یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔

۱۶- کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے، کہ اس نے کھلایا اور پلایا، اس موقع پر کئی مختلف دعائیں حدیثوں میں آئی ہیں، جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے:

الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین

یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔ (۳)

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاشربۃ فی النفخ فی الشراب ج ۲ ص ۵۲۴ و موطا امام محمد باب ماجاء فی شرب الرجل وھو قائم ص ۲۳۷ مطبعہ السعادہ مصر ۱۳۳۲ھ (۲) صحیح مسلم کتاب الاشربۃ باب الامر بتغطیۃ الاناء الخ ج ۲ ص ۱۸۲ (۳) عمل الیوم واللیلۃ ابن السنی باب مایقول اذا اکل جزء سادس ص ۱۴۹ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۱۵ھ۔

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہو، تاکہ یہ مجلس شرکا کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو، ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

۱۔ مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے، وہیں بیٹھ جانا چاہئے، یہ نہیں کرنا چاہئے کہ مجمع کو چیر کو خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے، کیوں کہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے، صحابہؓ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے (۱)، انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں، جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے، اسی لئے "تخطی رقاب"، یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

۲۔ مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہئے (۲)، کیوں کہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسروں کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے (۳)، دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا، کیوں کہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا،

---

(۱) ادب المفرد باب یجلس الرجل حیث انتھیٰ ص ۲۱۴ (۲) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھیۃ ان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ ج ۲ ص ۱۰۴ (۳) ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ھو احق بہ ج ۲ ص ۱۰۴۔

اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

۴- اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا (۱)، کیوں کہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لئے یا کسی اور مصلحتِ باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے ان کا الگ کردینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

۵- اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہئے، ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے (۲)، کیوں کہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منہ ہوگا اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی، جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تا کہ سب کو ہنسا سکیں اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

۶- مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہئے (۳)، کیوں کہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا تھا، اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزتِ نفس کو فنا کردیتے تھے، جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جاسکتا۔

۷- راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہئے، کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے اور ہر آیند و روند کو تکنا بداخلاقی ہے لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہئے، یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم کردینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا (۴)۔

---

(۱) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنھما ج۲ص۱۰۴

(۲) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھیۃ القعود وسط الحلقۃ ج۲ص۱۰۴ (۳) ابوداؤد کتاب الادب باب فی یقیوم الرجل للرجل من مجلسہ ج۲ص۶۶۴ (۴) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلوس بالطرقات ج۲ص۶۶۳۔

۸-انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے، اس لئے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے، ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے، کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں، جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے، ان میں الفت وموانست پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق واختلاف پیدا ہو جاتا ہے(۱)، ایک مشہور مثل ہے کہ ”اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ“ اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ ”آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لئے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے“ پھر فرمایا کہ اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے، مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا، یا اس کو خریدو گے، یا اس کی خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی، یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔(۲)

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی ازخود کوشش نہ کی جائے، کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے، فرمایا کہ ”اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے“۔(۳)

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے اور دوسروں کے لئے جگہ بنانے کے لئے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِى	اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی
الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ	کرو تو کشادگی کرو، اللہ تمہارے لئے کشادگی کرے گا اور
انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ اللہ ان کے رتبے اونچے

(۱) ادب المفرد باب الارواح جنود مجندۃ ص ۱۷۷ (۲) بخاری کتاب البیوع باب فی العطار وبیع المسک ج ۱ ص ۲۸۲ (۳) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی الاتکاء ج ۲ ص ۱۰۵۔

مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ. (مجادلہ:۵۸-۱۱)

کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا، اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہئے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، منافقوں کے اس طرزِ عمل کی برائی قرآن پاک نے برملا کی ہے:

اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مجادلہ:۵۸-۱۰)

یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے، کہ دل گیر کرے ایمان والوں کو۔

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا، دوسرے یہ کہ بدگمانی ہوتی ہے، کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، اسی لئے ارشاد ہوا کہ ''تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں، کہ اس سے تیسرا غم گین ہوگا'' (۱)۔

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہئے، کہ المجالس بالامانۃ قولِ نبوی ﷺ ہے۔ (۲)

☆

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی التناجی ج۲ص۶۶۲ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث ج۲ص۶۶۸۔

آدابِ ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لئے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا، اور تم نے جنت میں اپنے لئے ایک مکان بنالیا۔(۱)

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوش دلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہئے، اسی لئے فرمایا کہ ''تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے'' (۲)، ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن وسلامتی کا پیام ہو، جس کو شریعت نے السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے، چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور ہے، عرب کے لوگ ملاقات کے وقت ''انعم اللہ بک عینا'' ''وانعم اللہ بک صباحا'' کہتے تھے، یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، تمہاری صبح خوش گوار ہو، امراو سلاطین کے لئے دوسرے الفاظ تھے، ایرانی ''ہزار سال بزی'' ہزار برس جیو، کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو گڈ مارننگ (اچھی صبح) شام کو گڈ ایوننگ (اچھی شام) رات کو گڈ نائٹ (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، مگر اسلام نے ان سب کے بجائے ''السلام علیکم'' کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں:

۱۔ یہ تمام انبیا علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے

---

(۱) ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان ج۲ص۲۱ (۲) ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی صنائع المعروف ج۲ص۱۶۔

استعمالات سے جو انبیا علیہم السلام کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے ہیں، وَالسَّلَامُ عَلَیَّ (مریم ۱۹:۳۳) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں، وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (صٰفٰت: ۳۷-۱۸۱) ظاہر ہوتا ہے۔

۲- اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے، دنیوی تمتعات، مثلاً طولِ عمر، وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

۳- اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے، کیوں کہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے، وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

۴- اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروط طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس رضی اللہ عنہ بن سعد نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کیا کریں، تو آپ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی (۱)، ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لئے جھک جائے، فرمایا ”نہیں“ اس نے کہا ”تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے؟“ فرمایا ”نہیں“ (۲)، اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے، فرمایا ”ہاں“۔ (۳)

۵- دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جاسکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے، کہ یہ جان و مال، آل و اولاد، دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے۔

۶- جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المراۃ ص ۲۹۱ (۲) یہ ممانعت اس موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی محذور ہو مثلاً ملنے والا امرد ہو یا کوئی اور شہوت انگیز صورت ہو۔ (۳) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحۃ ج ۲ ص ۱۰۱۔

۷-اسلام نے اپنے پیروؤں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور ''واچ ورڈ'' مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بے گانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں، یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملتِ محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی:

یا ایہا الناس افشو االسلام و اطعموا الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام (۱)

لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو یہ سب کرو گے، تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض وغایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ ''تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ''۔(۲)

سلام کرنے کے لئے شناسا وغیر شناسا، جانے اور انجان کی تخصیص نہیں (۳)، مرد اور عورت کی تفریق نہیں (۴) بڑے اور بچے کی تمیز نہیں (۵)، البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لئے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب واحترام کا لحاظ کرے اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گذرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع وخاکساری کا اظہار ہو، اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہئے۔(۶)

---

(۱) ترمذی ابواب الزھد ابواب صفۃ القیامۃ ج۲ص۷۵ (۲) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی افشاء السلام ج۲ص۹۷ (۳) بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ ج۲ص۹۲۱ (۴) بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال ج۲ص۹۲۳ (۵) بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان ج۲ص۹۲۳ (۶) بخاری کتاب الاستیذان باب فی الراکب علی الماشی ج۲ص۹۲۱۔

ان مصالح کے لحاظ سے آپ ﷺ نے اپنے اہل وعیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا(۱) مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہئے(۲) سلام میں رحمۃ اللہ وبرکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ''السلام علیکم'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اس کو دس نیکیاں ملیں'' دوسرا آدمی آیا تو کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اس کو بیس نیکیاں ملیں'' تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اس کو تیس نیکیاں ملیں''(۳)۔

جس شخص کو سلام کیا جائے، اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں، ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرائے، چنانچہ خود قرآن نے یہی تعلیم دی ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (نساء:۴-۸۶)

اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو، یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہا کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے۔

۲- ملاقات کے وقت اظہارِ محبت اور اظہارِ مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لئے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جز قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے(۴) مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے(۵) اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول کرلیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا، بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسے

(۱) ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ ج۲ص۹۹ (۲) ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود ج۲ص۱۰۰ (۳) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماذکر فی فضل السلام ج۲ص۹۷ (۴) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحۃ ج۲ص۱۰۱ (۵) ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحۃ ج۲ص۷۰۸۔

دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے لیکن اگر کوئی شرعی محذور نہ ہوتو اس کی اجازت بھی ہے، چنانچہ ایک بار حضرت زیدؓ بن حارثہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو گلے لگالیا اوران کا بوسہ لیا۔(۱)

کسی محبوب ومحترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں، حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے اور جب آپ ﷺ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں، ایک موقع پر جب حضرت سعدؓ بن معاذ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپ نے تمام صحابہؓ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔(۲)

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کردیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لئے کھڑے ہوتے تھے اوراسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لئے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔(۳)

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔(۴)

۳- ملاقات یا کسی اور کام کے لئے کسی کے گھر میں جانے کے لئے صاحبِ خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اوراس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ . فَاِنْ	مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اوران سے سلام علیک کئے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کواس غرض سے دیا گیا ہے)

(۱) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المعانقة و القبلة ج۲ص۱۰۲ (۲) یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی القیام ج۲ص۷۰۸ میں ہیں۔(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل ج۲ص۲۶۴

(۴) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا ج۲ص۱۰۲۔

لَمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ.

(نور:۲۴-۲۷)

کہ (جب ایسا موقع ہوتو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمہارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لئے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔(۱)

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہوسکتے ہیں لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی کے مکان پر جاتے تھے، تو چوں کہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا (۲) اس لئے اجازت لینے سے پہلے دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے (۳)، تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپ ﷺ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوگئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو، کیوں کہ اجازت لینے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے (۴)، ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں (۵)، ایک بار کسی نے آپ ﷺ کے حجرے میں تاک جھانک کی، آپ ﷺ اس وقت لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو

(۱) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی النهی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجهن ج۲ص۱۰۶ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی العورات الثلاث ج۲ص۷۰۵ (۳) ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب ص۲۰۷ (۴) ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان ج۲ص۷۰۵۔ (۵) ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالة البیت ج۲ص۱۰۰ و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقئوا عینیه فلا دیة له ج۲ص۱۰۲۰۔

تو اس کو تمہاری آنکھوں میں کونچ دیتا، پھر فرمایا: **انما جعل الاذن من قبل البصر**، یا فرمایا: **انما جعل الاستیذان من اجل البصر** یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لئے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں۔(۱)

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں (۲)، تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہئے (۳)، البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں (۴)، اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے (۵) دوکانوں میں جانے کے لئے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں (۶) خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہئے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی، یا گھر میں غیر محرم عورتیں آ گئی ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لئے تھے لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے یا لونڈی غلام، اس لئے اگر ان کے لئے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں ان کے لئے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے، یعنی نماز عشا کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لئے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا:

---

(۱) اس کتاب کے باب ''اسلام کا فلسفۂ اخلاق'' کے ذیلی عنوان ''تجسس اور غیبت کی ممانعت'' میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں، انما الاذن لاجل الرویة، مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کئے گئے ہیں، دیکھئے صحیح بخاری کتاب الاستیذان باب الاستیذان من اجل البصر ج۲ص۹۲۲ و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ج۲ص۱۰۲۰

(۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الاستیذان (۳) ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرة یسلم الرجل فی الاستیذان ج۲ص۷۰۴ (۴) ادب المفرد باب دعاء الرجل اذنہ ص۲۰۶ (۵) ادب المفرد باب مالا یستاذن فیہ ص۲۰۹

(۶) ادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق ص۲۰۹۔

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لِيَسْتَـْٔذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَـٰنُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَـٰثَ مَرَّٰتٍ ۚ مِّن قَبْلِ صَلَوٰةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِنۢ بَعْدِ صَلَوٰةِ الْعِشَآءِ ۚ ثَلَـٰثُ عَوْرَٰتٍ لَّكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوَّٰفُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْأَيَـٰتِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۔ وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَـٰلُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَـْٔذِنُوا كَمَا اسْتَـْٔذَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ

(نور:۲۴......۵۸،۵۹)

مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر کو (سونے کے لئے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشا کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں، ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیوں کہ) وہ اکثر تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں، (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے) کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے، (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے اور (مسلمانو!) جب تمہارے لڑکے حدِ بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کے لئے) اذن مانگا کرتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیے۔

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ:۲۰-۴۴) تو تم ان سے نرم بات کہنا۔

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند، اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لئے فرمایا:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ:۲-۸۳) اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو، یہود آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے، اُنظُرنا (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ رَاعِنا کہتے، جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (بقرہ:۲-۱۰۴) اے ایمان والو! راعنا نہ کہو، انظرنا کہو۔

اس کی پوری تفصیل سورہ نساء رکوع ۷ میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہیں جو منصفانہ اور درست ہوں، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۔ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (احزاب:۳۳-۷۰) اے ایمان والو! خدا سے تقویٰ کرو اور بات سیدھی کہو، اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت

اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا. (احزاب:۳۳-۳۲)

تو (اے نبی کی بی بیو!) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو، ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہے، وہ خدا جانے تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کرلے گا اور بات کرو تو معقول، بے لاگ۔

مردوں کو نرم، معقول اور دل جوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے، فرمایا:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى (بقرہ:۲-۲۶۳)

نیک بات کہنی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا:

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ. (لقمان:۳۱-۱۹)

اور کچھ اپنی آواز پست کر کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہو:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. (مومنون:۲۳-۳)

اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

کیوں کہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے، خدا فرماتا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ. (ق:۵۰-۱۸)

آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا لیکن ایک نگراں اس پر حاضر رہتا ہے۔

اس لئے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ نیک بات کہے، یا چپ رہے" (۱)، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف ج ۱ ص ۳۸۔

نید کے ساتھ حضور ﷺ کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیوں کہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے“ (۱)، یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں، مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہارِ مطلب کے لئے ملی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہوں، پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے:

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا.	اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔
(فرقان: ۲۵-۶۳)	

گفتگو بہ ضرورت کرنی چاہئے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے، جو فضول باتیں کرتے ہوں اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں (۲)، یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تاقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تاقیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے (۳)، یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے، کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے، یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے، اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لئے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا (۴)۔

---

(۱) موطا و شرحہ للباجی باب ماجاء فی الصدق والکذب ص ۳۱۳، ۳۱۴ و ترمذی کتاب الزھد باب ماجاء من تکلم بالکلمۃ ج ۲ ص ۵۸ (۲) ادب المفرد باب فضول الکلام ص ۲۳۶ (۳) موطا امام مالک باب مایومر بہ من التحفظ فی الکلام ص ۳۰۹ (۴) موطا امام مالک باب ماجاء فی مایخاف من اللسان ص ۳۱۲۔

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے، بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے تا کہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے، اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے (۱) اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے، ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا، کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا (۲)، حضرت جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل اور ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں:

کان کلام رسول اللہ ﷺ کلاما فصلا یفهمه کل من سمعه (۳)	رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا، سمجھ لیتا تھا۔

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہئے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لئے بہتر ہوتا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں کیوں کہ اختصار بہتر ہے۔ (۴)

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لئے لوگ نہایت مسجع مقفیٰ اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں، گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ ”خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے جس

(۱) ابوداؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث ص ۵۱۴ (۲) ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث ص ۵۱۴

(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب الهدی فی الکلام ص ۶۶۵ (۴) ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التشدق فی الکلام ج ۲ ص ۶۸۳۔

طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے، نیز فرمایا کہ "جو شخص اسلوبِ کلام میں اس لئے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے (۱)، خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ نہ قبول کرے گا" (۲)۔

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے، بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے، تاکہ دوسروں کو عدمِ التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے (۳)۔

---

(۱) یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو۔ (۲) ابوداؤد کتاب الأدب باب ماجاء فی التشدق فی الکلام ج۲ ص۶۸۳ (۳) ادب المفرد باب اذا حدث الرجل لایقبل علی واحد ص۲۳۵۔

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاک ساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہئے، خدا اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (فرقان: ۲۵-۶۳)

اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔

اکڑ کر نہیں چلنا چاہئے، یعنی چال میں غرور اور تبختر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۱۷-۳۷)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ جاسکتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ (لقمان: ۳۱-۱۸)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہیں کرتا۔

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہئے، کیوں کہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشارِ خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گذرتی تھیں تو اپنی پازیب کی آواز سنانے کے لئے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (نور: ۲۴-۳۱)

اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔

شریف عورت جب بہ ضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپالے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب وزینت کی ساری

چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آجائے، تاکہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہیں، پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (احزاب:۳۳-۵۹)	اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہہ دے کہ نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی (۱) پڑیں، تو کوئی نہ ستائے۔
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ...الآیۃ (نور:۲۴-۳۱)	اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، مگر جو (فطرتاً) کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو (اخیر تک پڑھئے)۔

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوش بو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہئے (۲)، کیوں کہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں، اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے، عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے سے چلنا چاہئے، ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا اور اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں (۳)۔

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہئے، یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لئے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہئے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو، بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آکر جماعت میں ملو (۴)۔

---

(۱) یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتونیں ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں۔ (۲) سنن ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی خروج المرأۃ متعطرۃ ج ۲ ص ۱۰۷ (۳) ابوداود کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق ص ۷۱۲ (۴) صحیح مسلم کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار ج ۱ ص ۲۲۰ طبع قدیم کتب خانہ

مقدور ہوتو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لئے جوتے پہنے جائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو، یعنی جوتے پہن کر چلا کرو، کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے (۱)۔

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہئے، یا دونوں پاؤں ننگے رہیں، یعنی یہ نہیں کرنا چاہئے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو (۲)، کیوں کہ یہ ادب ووقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں (۳)۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب الانتعال ج۲ص۵۷۰ (۲) ایضاً (۳) ترمذی کتاب اللباس باب ماجاء فی الرخصة فی النعل الواحدة ج۱ص۳۰۷۔

آدابِ سفر

آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ میں سفر فرمایا اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لئے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب وہوا اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت ومطابقت رکھتے تھے، عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل وغارت گری، کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھ کر آنحضرت ﷺ نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں، جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں، تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، بالخصوص دیہات وقصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہوسکتے ہیں، جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے اور صحرا وبیابان کے راستوں میں ضروریاتِ زندگی کے وہ ساز وسامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

۱- سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہئے اور اس کو خیر وعافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہئے اور ہوسکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہئے جس کو رسول اللہ ﷺ فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے، (۱) استودع اللہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم "یعنی تمہارے دین، امانت، اور خاتمۂ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہوں"۔

۲- سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہئے (۲)، اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا، بلکہ پورا دن کام میں آجاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کرسکتا ہے۔

۳- سفر تنہا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئیں (۳) اس سے

---

(۱) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الدعاء عند الوداع ص ۳۵۰ (۲) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الابتکار فی السفر ص ۳۵۱ (۳) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الرجل یسافر وحده ص ۳۵۱۔

انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور اسبابِ سفر کی حفاظت ونگرانی میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

۴-اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنالینا چاہیے (۱)، اسی شخص کو کارواں سالار کہتے ہیں۔

۵-سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیے۔(۲)

۶-اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔(۳)

۷-سفر رات کو کرنا چاہیے، حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے (۴) اور درحقیقت لو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہرحال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لئے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت۔

۸-مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام وآسایش کا خیال رکھنا چاہیے۔

۹-رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہیے، کیوں کہ راستہ سے جانور گذرتے رہتے ہیں اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔(۵)

۱۰-جب سفر کی ضرورت پوری ہوجائے تو فوراً واپس آجانا چاہیے، کیوں کہ سفر بہرحال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے۔(۶)

☆

---

(۱) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی القوم یسافرون یومرون احدهم ص۳۵۱ (۲) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الطروق ص۳۸۳ (۳) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی التلقی ص۳۸۴ (۴) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی سرعة السیر ص۳۴۷ (۵) مسلم کتاب الامارة باب مراعاة مصلحة الدواب فی السیر والنهی عن التعریس فی الطریق ج۲ ص۱۴۵ (۶) مسلم کتاب الامارة باب السفر قطعة من العذاب ج۲ ص۱۴۵۔

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ (روم: ۳۰-۲۳)

اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔

سورۂ فرقان میں فرمایا:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا. وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا. وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا.

(فرقان: ۲۵-۴۷)

اور اسی نے تمہارے لئے رات کو پردہ اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔

سورہ نبا میں ہے:

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا. وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا. وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا.

(نبا: ۷۸-۹ تا ۱۱)

اور ہم نے نیند کو تمہارے لئے آرام اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لئے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لئے ہے، یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گذرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے، جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورہ نور (۲۴-۵۸) میں ہے، حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ اور رات آرام میں گذاری جائے اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے، جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے (۱)، یہ تو عام افراد کے لئے ہے لیکن خاصانِ خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے:

(۱) بخاری کتاب النکاح باب لزوجک علیک حق ج ۲ ص ۷۸۳۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ. یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔

(ذاریات:۵۱-۱۷)

۱-سنتِ نبوی ﷺ نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتادئے ہیں، نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہئے، کیوں کہ اس سے پہلے سوجانا غفلت کی نشانی ہے اور نمازِ عشا پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہوکر فوراً سوجانا چاہئے(۱)، یہ اس لئے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے اور اخیر رات میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے سستی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشا کے بعد اس کے لئے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نمازِ عشا کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ ﷺ نے بات چیت فرمائی ہے۔(۲)

۲-احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہئے، پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہئے۔(۳)

۳-ایسی چھت پر نہیں سونا چاہئے، جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو(۴) کیوں کہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

۴-پاکی کی حالت میں سونا چاہئے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے۔(۵)

۵-پیٹ کے بل نہیں سونا چاہئے، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں۔(۶)

۶-ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہئے(۷) کیوں کہ عرب کے لوگ عموماً تہ بند باندھتے تھے، اس لئے اس میں کشفِ عورت کا احتمال ہے، البتہ اگر یہ

---

(۱)ابوداؤد کتاب الادب باب النھی عن السمر بعد العشاء ص۶۶۲ (۲) صحیح مسلم کتاب الاشربۃ باب اکرام الضیف ص۲۰۰ (۳)ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم ص۶۸۸ (۴)ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر محجر ص۶۸۷ (۵)ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم ص۶۸۸ وباب فی النوم علی طھارۃ ص۶۸۷۔(۶)ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ ص۶۸۷ (۷)ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھۃ فی ذلک ج۲ص۱۰۵۔

اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، کیوں کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ ﷺ اس طریقہ سے لیٹے تھے۔(۱)

۷-سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہئے، کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہئے، چراغ کو بجھا دینا چاہئے، کیوں کہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لے جاتے ہیں، جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے، یہی حال آگ کا بھی ہے، ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آگ تمہاری دشمن ہے، جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو۔(۲)

۸-سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہئے، سب سے مختصر دعا یہ ہے، کہ سوتے وقت کہے، اللّٰھم باسمک احییٰ واموت (اے اللہ میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں) اور جاگے تو الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور (۳) (اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے) حدیثوں میں اس موقع کے لئے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں۔

---

(۱) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی وضع احدی الرجلین علی الاخری مستلقیا ج ۲ ص ۱۰۵۔

(۲) بخاری کتاب الاستیذان باب لا یترک النار فی البیت عند النوم وباب اغلاق الابواب باللیل ج ۲ ص ۹۳۱، مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے۔(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم ص ۶۸۸۔

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی، جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہئے وہ چھپے رہیں، اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جز ٹھہرایا، یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لئے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں اور گٹوں تک اور لونڈیوں کے لئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے (۱) جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں، یہاں تک کہ تنہائی میں بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں، ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا، خدا تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہئے (۲)، ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو، کیوں کہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں، جو بہ ضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو (۳)۔

حضرت آدمؑ اور حواؑ کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے:

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (اعراف: ۷-۲۲)	تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا، ان کے ستر ان پر کھل گئے، تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔

(۱) عورت کا چہرہ، قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔ (۲) سنن ترمذی ابواب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی حفظ العورۃ ج ۲ ص ۱۰۷۔ (۳) ایضاً باب ماجاء فی الاستتار ج ۲ ص ۱۰۷۔

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا میں آکر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرم گاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انہوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورت خانۂ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے (۱)، ورنہ یوں ہی ننگے پھرا کرتے تھے، وحیِ الٰہی نے انسانوں کو تہذیب وسلیقہ کا یہ سبق دیا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف:۷-۲۶)	اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف:۷-۳۱)	اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (اعراف:۷-۳۲)	کہہ دے! کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے۔
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (اعراف:۷-۳۳)	کہہ دے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی منع کیا ہے۔

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ ستر پوشی ہے، ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب وزینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصولِ کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سے جزئیات کو حاوی ہے:

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف:۷-۲۶)	اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

پرہیز گاری کے لباس سے کیا مقصود؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمالِ صالحہ اور یا شرم وحیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا

(۱) صحیح مسلم کتاب التفسیر تفسیر فی قول اللہ تعالیٰ خذوا زینتکم الخ ج ۲ ص ۵۴۹ وطبری تفسیر آیات ذیل ج ۸ پ ۸ ص ۹۹ ومابعد۔

چاہئے، اسی لئے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے، مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد وورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں (۱) لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیز گاری ہی کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہیئے جو تقویٰ اور پرہیز گاری کا منشا ہو اور جو لباس تقویٰ اور پرہیز گاری کا منشا ہے، اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمۂ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں:

''اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے''

(تفسیر اعراف آیت مذکور)

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے، اس حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے:

۱- مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہئے کیوں کہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جد وجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے، ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں، تا کہ اس کی لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں، یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھر دراپن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگالے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

۲- مردوں کے لئے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لئے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں، کیوں کہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے، آنحضرت ﷺ نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور وطریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور وطریق کی نقالی کریں، لعنت فرمائی ہے۔

---

(۱) روح المعانی تفسیر آیتِ مذکور ج ۸ پ ۸ ص ۹۰۔

۳-عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہ بند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، ان کے بڑے بڑے امرا اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنے ہی اونچے تہ بند باندھتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی اپنا ازار فخر وغرور اور بڑائی کے اظہار کے لئے گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا، اسی لئے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہ بند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائیں، بلکہ آپ ﷺ نے پسند فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہ بند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہے، فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں فرماتا البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

۴-ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں، پہننا ٹھیک نہیں، خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں، یا مولویوں کا نمائشی عبا، جبہ یا صوفیوں کا گیروا رنگ کیوں کہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے اور یہ تفوق وامتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

۵-مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ”کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں“۔

۶-ایسا کپڑا پہننا جس سے ستر پوشی نہ ہو، یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں، جائز نہیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن اسماءؓ کوئی ایسا ہی (۱) کپڑا پہن کر حضور ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا، اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا حلال نہیں۔

۷-مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ ﷺ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں، آپ ﷺ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے، البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں اور خوش بو کے لئے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا، مردوں کے

(۱) یا باریک۔

لئے منع ہے، سبز رنگ کی چادر بھی آپ ﷺ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہ بند بھی آپ ﷺ نے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمامہ زیبِ سر فرمایا ہے۔

۸- مردوں کے لئے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

۹- آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہئے۔

۱۰- نیا لباس پہنتے وقت آپ ﷺ دعا پڑھا کرتے تھے، جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا پڑھتے تھے (۱):

الحمد لله الذی کسانی هذا ورزقنیه من غیر حول منی وقوة	اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)۔

(۱) اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں، میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد اور ترمذی ہیں، ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

آدابِ مسرت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں، مال و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہارِ مسرت کے سیکڑوں موقع پیش آتے ہیں لیکن یہ مسرت جب حدِ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا:

اِذْقَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ. (قصص:۲۸-۷۶)

جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت، اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔

اسلام نے چوں کہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لئے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ. وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ. (ھود:۱۱-۱۰)

اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے مہر، پھر وہ چھین لیں اس سے تو وہ ناامید، ناشکر ہو اور اگر ہم چکھادیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو کہنے لگے گئیں برائیاں مجھ سے تو وہ خوشیاں کرتے بڑائیاں کرتا۔

اور اس کی ممانعت کی ہے:

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. (حدید:۵۷-۲۳)

اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اتراتے بڑائی مارتے کو۔

ساتھ ہی اس نے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقے پر اظہارِ مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجالانا چاہئے، تاکہ

غایتِ مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بہ جائے انسان کی نیاز مندی کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدۂ شکر بجالاتے۔

ایک بار مکہ سے مدینہ کو جارہے تھے، جب غزورا کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اس کے بعد دیر تک ٹھہرے رہے، پھر ہاتھ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدے میں گر پڑے، اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدے میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں نے خدا سے اپنی امت کے لئے شفاعت کی دعا کی تو اس نے میری ثلثِ امت کے لئے شفاعت قبول کر لی، اس لئے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدے میں گر پڑا، پھر میں نے سر اٹھا کر اپنی امت کے لئے یہی درخواست کی، تو اس نے میری ثلثِ امت کے لئے اور میری درخواست قبول کی، اس لئے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدے میں گر پڑا، پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلثِ امت کے لئے اور میری التجا کو قبول کیا، تو میں اپنے خدا کے لئے سجدے میں گر پڑا، (۱)۔

صحابۂ کرامؓ کا بھی یہی دستور تھا، چنانچہ حضرت کعبؓ بن مالک کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا، تو وہ سجدے میں گر پڑے، اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارک باد دے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں، چنانچہ اس موقع پر صحابۂ کرامؓ بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اور ان کو مبارک باد دی۔ (۲)

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے، اس موقع پر اعزہ واحباب کی دعوت کی جاسکتی ہے، کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا (۳) اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں تا کہ اس طریقے سے ان کی مسرت کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا، جس میں بچے بھی شامل تھے۔ (۴)

---

(۱) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی سجود الشکر ص ۳۸۳ (۲) بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالک ج ۲ ص ۶۳۶۔

(۳) ابوداؤد کتاب الاطعمه باب الاطعام عند القدوم من السفر ص ۵۲۶ (۴) ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی التلقی ص ۳۸۴۔

اجتماعی طور پر اظہارِ مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے اظہارِ مسرت کے لئے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے، تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

فصل ما بین الحلال والحرام الدف والصوت(۱) — حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے، تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ کا نکاح ہوا تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے، چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیعؓ بنت معوذ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے، اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا:

وفینا نبی یعلم مافی غد — ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور جو گا رہی تھیں، اسی کو گاؤ (۲)۔

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہؓ تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا، کیوں کہ انصار کو گیت پسند ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی (۳)۔

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہؓ بن کعب اور ابو مسعود انصاریؓ بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے، اتنے میں عامرؒ بن سعد ایک تابعی آ گئے، انہوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے، انہوں نے کہا تمہارا جی چاہے تو تم بھی بیٹھ کر سنو، رسول اللہ ﷺ نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی

(۱) ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اعلان النکاح ج ۱ ص ۲۰۷ (۲) بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ ج ۲ ص ۷۷۳ (۳) بخاری کتاب النکاح باب النسوۃ اللاتی یھدین المرأۃ الی زوجھا ج ۲ ص ۷۷۵ ودعائھن بالبرکۃ مع فتح الباری۔

اجازت دی ہے (۱)۔

عربوں میں رسم تھی کہ دولہا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی:

بارک اللہ لک وبارک علیک وجمع بینکما فی خیر (۲)

تمہارے لئے اللہ مبارک کرے، تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملاپ رکھے۔

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیمہ کہتے ہیں، جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو (۳) اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں (۴) اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفے کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں (۵)۔

مسلمانوں کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی اظہارِ مسرت کا موقع عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن پیش آتا ہے، زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کئے تھے جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دو دنوں میں خوشیاں مناتے تھے، اب خدا نے ان کو تمہارے لئے ان سے دو بہتر چیزوں سے بدل دیا ہے، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن (۶)، خوشی کے ان دو دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا، بلکہ دینِ حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہارِ مسرت کے لئے پسند کیا گیا، عید اضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بنا اور فتح کی اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔

ان دونوں دنوں میں اظہارِ مسرت کے لئے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا، اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا، حضرت عائشہؓ کا

(۱) نسائی کتاب النکاح باب اللهو والغناء عند العرس ج ۲ ص ۷۷ (۲) ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یقال للمتزوج ج ۱ ص ۲۹۰ (۳) بخاری کتاب النکاح باب الولیمة ولو بشاة ج ۲ ص ۷۷۷ (۴) نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر ج ۲ ص ۷۶ (۵) نسائی کتاب النکاح باب الهدیة لمن عرس ج ۲ ص ۷۷ (۶) نسائی کتاب صلوة العیدین باب العیدین ج ۱ ص ۱۱۳ مطبع ناصری دہلی ۱۲۸۱ھ

بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دولونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں وہ اشعار گا رہی تھیں جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ ''شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں'' لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اے ابوبکر! ہر قوم کے لئے عید کا ایک دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے'' (۱) یعنی اس دن گانا مباح ہے (۲)۔

حبش لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے، رسول اللہ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے، ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیوں سے کہا کہ ''ہاں بنوارفدہ!'' اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہاں تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپ ﷺ نے کہا کہ ''بس'' انہوں نے کہا ''ہاں'' ارشاد ہوا تو جاؤ (۳)۔

مسرت کے اس طریقۂ اظہار کا نام ''تقلیس'' تھا، جس کے معنی دف بجانے گانے اور دل چسپی کے لئے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں، عہد رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہؓ کو کسی جگہ عید کے دن اظہار مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا تو ان کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی، تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگ ''تقلیس'' کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

حضرت قیسؓ بن سعد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں، بہ جز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے سامنے ''تقلیس'' ہوتی تھی (۴)۔

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقۂ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی وقومی جشن کے

---

(۱) بخاری کتاب العیدین باب سنة العیدین لاهل الاسلام ج ۱ ص ۱۳۰ (۲) بشرطے کہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہوں۔ (۳) بخاری کتاب العیدین باب الحراب والدرق یوم العید ج ۱ ص ۱۳۰ (۴) ابن ماجہ کتاب الصلوۃ باب ماجاء فی التقلیس یوم العید ص ۹۳۔

آئیں جن میں لوگ کھل کر خوش کرسکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساطِ خاطر کا اظہار کرلے، اسی لئے ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے، اہل وعیال سے لطف اٹھانے اور یادِ الٰہی کے ہیں (۱)۔

اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو، اسی لئے عید کے دودنوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عید گاہ کو جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان وشوکت کا اظہار ہو اور لِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَاهَدٰكُمْ (بقرہ:۲-۱۸۵) کی تکمیل ہو۔

(۱) شرح معانی الآثار طحاوی ص ۴۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل وعیال سے لطف اٹھانا کردیا گیا ہے۔

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توام ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے، غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے، عربوں میں فخر وغرور اور جہالت ووحشت کی وجہ سے تعزیت وماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہوگئی تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لئے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہوگئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہئے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

اذا مت فانعینی بما انا اهله وشقی علی الجیب یا ابنة معبد (۱)

جب میں مرجاؤں تو میرے لئے میرے درجے کے موافق رونا اور میرے لئے گریبان کو چاک کر ڈالنا۔

منہ پر تھپڑ مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عام رسم تھی اور شعرا اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے:

من کان مسرورا بمقتل مالک فلیات نسوتنا بوجه نهار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا تو ہماری مستورات کو دن دہاڑے آکر دیکھے

یجد النساء حواسراً یندبنه یلطمن اوجههن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کے وقت اپنے گالوں پر طمانچے مار رہی ہیں

آنحضرت ﷺ نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ نے فرمایا کہ "جو شخص گریبان پھاڑتا اور گالوں پر طمانچے مارتا اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے وہ میری امت میں سے نہیں۔" (۲) یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

---

(۱) شرح المعلقات السبع، طرفة بن العبد ص ۶۱ مطبعه العامره عثمانیه ۱۳۰۴ھ (۲) ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی النهی عن ضرب الخدود ج ۱ ص ۱۹۵۔

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ ﷺ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ ''ان کے منہ میں خاک بھردو'' (۱)۔

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں، اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخلِ مراسم ہوگئی، یعنی کسی میت کے لئے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا، ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''وہ کون سی بات ہے جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے'' آپ نے فرمایا یہ کہ ''نوحہ نہ کرو'' وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آکر روئی تھیں، ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے، آپ ﷺ نے منع فرمایا لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں، بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی لیکن وہ خاتون آنحضرت ﷺ کا اصلی منشا سمجھ گئی تھیں، اس لئے پھر کبھی کسی کے نوحے میں شریک نہیں ہوئیں (۲)۔

دستور تھا کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں، اس کو عربی میں ''نَــعْــی'' کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے، حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو (فرمانِ نبوت کی اس قدر احتیاط مدنظر تھی کہ) وصیت کی کہ ''میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا میں نے آنحضرت ﷺ کو اعلانِ مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو''۔ (۳)

جنازے کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے اور بخوردان (۴) جلا کر لے جاتے، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ جنازے کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے، راگ سے مقصود کفارِ ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہوسکتا ہے، تب یہ مطلب ہوگا کہ ''جنازے کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے'' (۵)، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک جنازے میں شریک تھے،

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبة یعرف فیه الحزن ج۱ص۱۷۳ (۲) ترمذی تفسیر سورہ ممتحنہ ج۲ص۱۶۶ (۳) ترمذی کتاب الجنائز باب کراهیة النعی ج۱ص۱۹۲ (۴) صحیح مسلم کتاب الایمان باب الاسلام یهدم ماقبله ج۱ص۶۰ ومسند احمد ج۴ص۱۹۹ (۵) ابوداؤد کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بها المیت ج۲ص۳۵۲ مع بذل المجهود فی شرح ابی داؤد ج۴ص۱۹۹ مطبوعہ جید برقی پریس دہلی۔

ایک عورت انگیٹھی لے کر آئی، آپ ﷺ نے اس کو اس زور سے زجر کیا (۱) کہ وہ بھاگ گئی۔

جنازے کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے، صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بددعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں، لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا (۲)۔

آنحضرت ﷺ نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی اور فرمایا کہ کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے، البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا، جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے، خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرائش وزیبائش کرے۔ (۳)

کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے، برا نہیں لیکن زور زور سے چیخنا چلانا، بین کرنا منع ہے اور اس پر سخت تہدید فرمائی، آنحضرت ﷺ کے صاحب زادہ حضرت ابراہیمؑ نے جب وفات پائی تو آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے (۴)۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے، صحابہؓ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلافات ہیں، جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر وغرور کے لئے حسبِ حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، اسی وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے (۵)۔

ہم دردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو، تو مناسب ہے کہ عزیز، دوست، یا محلّہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں، کیوں کہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے، آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر

---

(۱) اسد الغابة ج۴ ص۳۹۵ مصر (۲) ابن ماجه كتاب الجنائز باب ماجاء فى النهى عن التسلب مع الجنازة ص۱۰۸ (۳) ترمذى كتاب الطلاق باب ماجاء فى عدة المتوفى عنهازوجها ج۱ ص۲۲۷ (۴) مسلم كتاب الفضائل باب رحمته ﷺ الصبيان والعيال ج۲ ص۲۹۱ (۵) فتح البارى ج۳ ص۱۲۲۔

ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا (۱)۔

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، صبر اور دعا دفعِ غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے، وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ:۲-۴۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے، یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری پر صبر کیا جائے، آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو جو اپنے بچے کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا مگر وہ نہیں مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ ﷺ تھے، تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہئے (۲)۔

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (بقرہ:۲-۱۵۶) اسی لئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارۂ کار ہے، جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا، یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتا دیا ہے:

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ (حدید:۵۷-۲۳) تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعة الطعام لاهل الميت ج۲ص ۴۴۷ (۲) ایضاً باب الصبر عند المصیبة ج۲ص ۴۴۵، ۴۴۶۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کرنا گواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جمہائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے، آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ انگیز شکل پیدا ہوجاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے ”جمہائی شیطان کی جانب سے ہے اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے“ (۱)، بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمہائی لے تو اپنے منہ کو بند کرلے، کیوں کہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے (۲)، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت ومجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کردیتا ہے (۳)، اس لئے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

۱- پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمہائی روکنے کی چیز ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہئے اور ہاہ ہاہ نہیں کرنا چاہئے اور اگر یہ نہ ہوسکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے۔ (۴)

۲- جمہائی کے برخلاف آپ ﷺ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے، بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے (۵)، ہمارے شراحِ حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے لیکن جمہائی بدن کے ثقل اور کسل وسستی کا نتیجہ ہے، اس لئے چھینک عمل کے لئے نشاط اور جمہائی اس کے لئے کسل پیدا کرتی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے (۶) اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر

(۱) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاوب ج ۲ ص ۱۰۳ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التثاوب ج ۲ ص ۶۸۵ (۳) حجۃ اللہ البالغۃ اداب الصحبۃ ج ۲ ص ۱۴۹ (۴) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاوب ج ۲ ص ۱۰۳ (۵) ایضاً (۶) حجۃ اللہ البالغہ باب العطس والتثاوب ج ۲ ص ۱۴۹۔

کرے اور ''الحمد للہ'' کہے، دوسرے لوگ اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہیں (۱)۔

۳- تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے، بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے، اس لئے چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہئے اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا۔ (۲)

۴- انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ ﷺ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے، خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جماہی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور ان کی تضعیف وتردید نہیں کی ہے، بلکہ بعض کی تائید کی ہے (۳) بہر حال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے، اس لئے مجمع عام میں اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کے سامنے ڈکار لی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو، کیوں کہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے (۴) اس حدیث سے پرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے۔

آداب کا فلسفہ: شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغۃ میں ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

تمام متمدن ملکوں کے باشندوں نے خورد ونوش، نشست وبرخاست اور وضع ولباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی ومعاشرتی حالات میں فطرتاً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے اور اس میں مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔

۱- بعض لوگوں نے ان کی بنیاد حکمتِ طبعی کے قواعد پر رکھی ہے اور ان آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کے رو سے مفید ہیں۔

---

(۱) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف یشمت العاطس ج۲ ص۹۶ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس ج۲ ص۶۸۶ (۳) فتح الباری ج۱۰ ص۵۰۶ (۴) ترمذی ابواب الزھد ابو اب صفۃ القیامۃ باب حدثنا ج۲ ص۷۴، ۷۵۔

۲- بعض لوگوں نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے اور اس میں اپنے مذہب کی پابندی کی ہے۔

۳- بعض لوگوں نے اس معاملہ میں اپنے بادشاہوں، حکیموں اور راہبوں کی تقلید کی ہے، ان کے علاوہ اور اصول وقواعد بھی ہیں جن میں بعض مفید اور بعض مضر ہیں اور بعض میں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کی جائے اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے اور جن میں نفع ونقصان کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی اباحت کی حالت میں قائم رکھے جائیں، ان مصلحتوں کی بناپر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس میں امورِ ذیل کا لحاظ رکھا۔

۱- ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہے اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی، اس لئے شریعت نے ان سے پہلے ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائیں مسنون کر دیں جو خدا کو یاد دلاتی ہیں۔

۲- بعض افعال واشکال شیطانوں کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں، مثلاً ایک جوتہ پہن کے چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا، اس لئے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، اس کے بہ خلاف بعض باتیں ایسی ہیں جو فرشتوں سے قریب کر دیتی ہیں، مثلاً گھر میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا، اس لئے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے۔

۳- بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے تجربتاً تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو، سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بناپر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں۔

۴- بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

۵- بعض چیزیں وقار وتمدن کے منافی ہیں اور انسان کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی، تا کہ افراط وتفریط کے درمیان توسط اور اعتدال کی راہ نکل آئے (۱)۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۱۳۳۔

اس تفصیل کے پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی ومعاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسولِ انام ﷺ کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی غرض ہر قسم کے فوائد ومنافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا، رسول اللہ ﷺ کی اتباع، روح اور جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار اور طریقِ زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن ومعاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان میں جو اصولی اور بنیادی باتیں ہیں ان کی تو قرآن پاک اور احادیثِ نبویہ میں پوری تاکید کردی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے لیکن ان میں بعض ایسے امور بھی ہیں جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لئے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعارِ اسلامی ہونا ظاہر ہو، یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید (۱) فرمائی گئی ہو اور اسی لئے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتادئے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے تو وہ برا نہیں، جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے، وہاں اگر مٹی کی جگہ صابون استعمال کیا جائے، تولئے کام میں لائے جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت (۲) کاٹا جائے، پلیٹیں بدلی جائیں، یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کئے جائیں، یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں، تو اس کی پوری اجازت ہے لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق ومحبت کا ہے، جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں ان کے لئے زمانہ کچھ ہی بدل جائے، مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

☆

(۱) ہمارے فقہانے اسی کو سنن الھدی اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ (۲) آنحضرت ﷺ نے چھری سے کاٹ کر گوشت کھایا ہے۔

حکمت ربانی کا چشمۂ نور

یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (بقرہ:۲-۱۲۹)

ناظرین آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آگیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل، اس کے تہذیب وتمدن کے اصول کتنے اعلا اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں اور یہ کچھ ایک نبیِ امی علیہ الصلوۃ والسلام کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا، اگر حضور علیہ السلام کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ، فلاسفۂ روزگار اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے، معلمِ امی ﷺ کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب وتمدن سے ناآشنا، اخلاقِ عالیہ سے بے گانہ اور سلیقہ وشعور سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق وتمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم وتربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کردی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوؤں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہیے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیلی نسل کے خاتم المرسلین ﷺ کی آمد کے لئے کی گئی تھی، یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ "یعنی ایسا نبی جو ان امیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق وحکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم وتربیت سے پاک وصاف کرکے نکھار دے" یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پر بہار بنا گیا ﷺ۔

امیدوارِ رحمت

سید سلیمان ندوی

۲۹/ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ/ہجری

اشاریہ وکتابیات

سیرۃ النبی ﷺ

(حصہ ششم)

مرتبہ

کلیم صفات اصلاحی

رفیق دارالمصنّفین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

اشخاص

(غ)

(ف)

کتب

(ش)

(ص)

(ط)

(ع)

مقامات